itsurdu.blogspot.com

ہندستانی ادب کے معمار

سیماب اکبرآبادی

Rashid Ashraf
zest70pk@gmail.com

حامد اقبال صدیقی

itsurdu.blogspot.com

Seemab Akbarabadi : A monograph in Urdu by Hamid Iqbal Siddiqui on the Urdu author. Sahitya Akademi, New Delhi (2009), Rs. 40.

© ساہتیہ اکادمی

پہلا ایڈیشن : 2009

ساہتیہ اکادمی

ہیڈ آفس :

رویندر بھون، 35 فیروز شاہ روڈ، نئی دہلی 110 001

سیلس آفس : 'سواتی' ، مندر مارگ، نئی دہلی 110 001

علاقائی دفاتر :

جیون تارا بھون، 23 اے/144 ایکس، ڈائمنڈ ہاربر روڈ، کولکاتا 700053

172، ممبئی مراٹھی سنگھرالے مارگ، دادر، ممبئی 400014

سینٹرل کالج کیمپس، ڈاکٹر بی۔ آر۔ امبیڈکر ویدھی، بنگلور 560001

مین بلڈنگ، گونا بلڈنگس (دوسری منزل)، 443(304)، اناسلائی، تینم پیٹ، چینئی 600018

قیمت : 40 روپے

ISBN 978-81-260-2438-4

ویب سائٹ : www.sahitya-akademi.gov.in

طابع : آر کے آفسیٹ پروسیس، دہلی

فہرست

خاندان 7
پیدائش، بچپن، تعلیم، شاعری کی ابتدا 11
ملازمت، شادی، اولاد 15
تلمذ 19
بیعت 26
کانگریس کا مشاعرہ 31
قصرالادب 32
قیام لاہور 34
ایک اور موڑ 36
مشاغل کی کثرت 37
رسالہ شاعر 41
الہام منظوم 45
غزلیات 48
منظومات 55
کفر کا فتویٰ 69
رباعیات 71
وحی منظوم 74
عزائی شاعری 80

itsurdu.blogspot.com

افسانہ، ڈراما، ناول	83
شاعر کی راتیں	85
خطباتِ شاعری	87
تلامذہ اور اصلاحِ سخن	94
رازِ عروض اور دستور الاصلاح	99
آگرہ اسکول	104
آخری سفر اور وفات	111
شخصیت	119
تصنیفاتِ سیماب	124
جہانِ دیگر	130
انتخابِ غزلیات	132

خاندان

عہدِ مغلیہ کا ہندوستان علاقائی اقتدار کی رسہ کشی، چھوٹی بڑی جنگوں اور بیرونی حملوں کے باوجود تہذیبی، ثقافتی اور اقتصادی سطح پر کافی خوشحال تھا خصوصاً عہدِ جہانگیری اور عہدِ شاہجہانی کا بغور مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وسیع و عریض سلطنتِ مغلیہ پر دہلی کے تخت کی گرفت کافی مضبوط تھی، ملک بھر میں دولت کی کافی فراوانی تھی اور یقیناً ہمارا ملک 'سونے کی چڑیا' تھا۔ چوں کہ اقتدار اور اندرونی تجارت پر مسلمانوں کا غلبہ تھا لہٰذا دیگر مسلم ممالک سے بھی تجارتی قافلے بلا روک ٹوک ہندوستان آتے تھے۔ ان غیر ملکی تاجروں میں سے بیشتر ہندوستان کے امن و سکون اور معاشی آسودگی سے متاثر ہو کر یہیں کے ہو رہتے تھے اور یہ ایک عام سی بات تھی۔ عموماً ایسے لوگ یہیں شادی بیاہ کر کے اور مقامی اور علاقائی رسوم و رواج کو اپنا کر نیز مقامی زبانوں اور بولیوں کو سیکھ کر یہاں کے عظیم تہذیبی اور ثقافتی ماحول میں کچھ نئے رنگوں کا اضافہ کرتے تھے۔ ہندوستان آنے والے ایسے مسلمانوں میں وہ بھی تھے جن کا تعلق عرب کے ان خاندانوں سے تھا جو آلِ صحابہؓ تھے اور وہ بھی تھے جو بیرونِ عرب اسلام کی روشنی پھیلنے کے بعد مشرف بہ اسلام ہونے والے خاندانوں سے متعلق تھے۔

حضرت سیماب اکبرآبادی کے مورثِ اعلیٰ شیخ صدیقی تھے اور شال دو شالے کی تجارت کے سلسلے میں بخارا سے ہوتے ہوئے شہنشاہ جہانگیر کے عہد میں ہندوستان آئے اور یہاں کے ماحول اور مزاج سے متاثر ہو کر آگرہ میں قیام پذیر ہوئے۔ اس دور میں چونکہ نومسلم اپنے نام کے ساتھ صدیقی، فاروقی، عثمانی یا علوی لگانے کی جسارت نہیں کرتے تھے اور ایسی نسبتیں خلفائے راشدینؓ کی آل کے ساتھ ہی مخصوص تھیں لہٰذا قیاس اغلب ہے (اور بزرگوں سے بھی یہی سنا ہے) کہ حضرت سیماب کے خاندان کو سیدنا ابوبکر صدیقؓ سے راست نسبت ہے لیکن اس کا اظہار حضرتِ سیماب کی کسی تحریر سے نہیں ہوتا اور نہ ہی کوئی

itsurdu.blogspot.com

شجرہ دستیاب ہے، بہرحال یہ خاندان آگرہ ہی میں نسل در نسل آباد رہا۔

حضرت سیماب کے جدِ امجد شیخ نبی بخش صدیقی نے خاندانی تجارت کا سلسلہ ختم کر کے گورنمنٹ پریس الہ آباد میں ملازمت اختیار کر لی تھی۔ ان کا ایک چھوٹا بھائی تھا اور ایک بہن تھی، جن کی کوئی تفصیل نہیں ملتی۔ مولانا شیخ محمد حسین صدیقی شیخ نبی بخش صدیقی کے اکلوتے بیٹے تھے۔ اپنے والد مولانا شیخ محمد حسین صدیقی کے تعلق سے حضرت سیماب 'کلیم عجم' کے باب 'شعر الحیات' میں لکھتے ہیں:

> "فاضل عصر اور عالم متبحر تھے۔ اجمیر شریف میں ٹائمس آف انڈیا پریس کی شاخ کے افسر اعلیٰ تھے۔ دینیات کے دلدادہ اور مذہب کے پابند، کئی کتابوں کے مصنف، گلدستۂ عطار کے چار حصے، مجموعۂ شہادت، کرامات غوثیہ آپ کی تصانیف سے اب تک مقبول و مروج ہیں۔ 'شعر الحدیث' کے نام سے ایک ماہنامہ رسالہ آپ کی ادارت میں شائع ہوتا تھا، رسالہ 'رہنما' اجمیر کی ادارت میں بھی آپ کا ہاتھ تھا۔ شعر بھی کہتے تھے لیکن عام طرز شاعری سے آپ کو کوئی دلچسپی نہ تھی۔ حکیم امیر الدین عطار اکبرآبادی کے شاگرد تھے۔ تمام راجپوتانے میں اس وقت مرحوم سے بہتر کوئی واعظ نہ تھا۔"

مولانا محمد حسین صدیقی اردو، انگریزی، عربی اور فارسی زبانوں میں خاصی مہارت رکھتے تھے، اس وقت اکبرآباد (آگرہ) میں مولوی غلام امام شہید الہ آبادی اور حکیم امیر الدین عطار اکبرآبادی میلاد خوانی میں بہت مشہور تھے۔ مولانا محمد حسین حضرت عطار کے شاگرد ہو گئے اور ان کے زیر تربیت نعت خوانی اور میلاد خوانی میں کمال حاصل کیا۔ ٹائمس آف انڈیا کی ملازمت کے دوران بھی انھوں نے یہ سلسلہ جاری رکھا اور پورے راجپوتانہ میں نعت خوانی اور میلاد خوانی میں خاصی شہرت پائی۔ ان کا تخلص فقیر تھا لیکن وہ صرف مذہبی شاعری تک ہی محدود رہے اور اپنا بیشتر کلام اپنے استاد عطار اکبرآبادی کی نذر کر دیا۔ انھوں نے 'گلدستۂ عطار' چار حصوں میں مرتب کیا تھا۔ ان چار جلدوں میں انھوں نے ولادتِ رسول پاکؐ سے معراج شریف تک کے حالات تحریر کیے تھے۔ 'گلدستۂ عطار' کا پانچواں حصہ خود حضرت سیماب نے مرتب کیا تھا۔ اعجاز صدیقی مرحوم نے رسالہ 'شاعر کے' آگرہ اسکول نمبر' مطبوعہ 1937 میں مولانا کے جو اشعار شائع کیے تھے وہ نمونۂ کلام کے طور پر ذیل میں درج ہیں:

وہ جو حوصلہ تھا حسین کا نہ تو دید ہے نہ شنید ہے
کہا دیکھ آئینہ تیغ کا، مجھے حسن یار کی دید ہے
جو لہو گلے سے رواں ہوا، کہا عاشقوں کی یہ عید ہے
جو نثار سجدے میں سر کرے وہ امام ہے وہ شہید ہے
مرا یاد حق میں جو کام ہو، تو خدا کے بندوں میں نام ہو
مجھے وصل یار مدام ہو، مری آرزو یہ تمام ہو

مولانا محمد حسین صدیقی 1844 کے آس پاس پیدا ہوئے۔ مسلکی اعتبار سے وہ حنفی سنی تھے، تقریباً 1874 میں ان کی شادی ہوئی تھی، شادی کے آٹھ برس بعد ان کے یہاں پہلا بچہ پیدا ہوا اور اسی بچے کو بعد میں دنیائے شعر و ادب میں علامہ سیماب اکبرآبادی کے نام سے شہرت حاصل ہوئی۔ حضرت سیماب کے علاوہ مولانا محمد حسین صدیقی کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ بیٹوں کے نام حاجی عبدالکریم اور صادق حسین تھے۔

مولانا محمد حسین 1896 میں مرض سل میں مبتلا ہونے کے بعد ملازمت ترک کر کے اپنے آبائی وطن آگرہ لوٹ آئے اور وہیں اپریل 1897 میں بعمر پچاس سال انتقال فرما گئے۔ اپنے گھر اور خاندان کے تعلق سے خود حضرت سیماب 'کلیم عجم' کے باب 'شعر الحیات' (14 دسمبر 1935) میں نہایت جذباتی انداز میں یوں تحریر فرماتے ہیں:

> "... یہ مکان اب بھی اپنی حدود متعارفہ کے ساتھ اپنی جگہ پر موجود ہے لیکن اس کے مکین اپنی سکونت دوسری دنیا میں منتقل کر چکے ہیں اور نئے مالکانِ مکان نے وہ الٰہی کا درخت بھی کاٹ دیا ہے جو برسات کے موسم میں ہمیشہ محلے بھر کی خواتین کے جھولے سے جھوما کرتا تھا اور جس کے قرمزی پھولوں کا ترش و شیریں ذائقہ اب تک میرے کام و دہن میں محفوظ ہے۔ آہ، وہ آباد گھر، مقدس نفوس سے معمور خاندان! دادا صاحب، ان کے بھائی، ان کی بہن، دادی صاحب، والد صاحب، والدہ ماجدہ، میرے دو بھائی، دو بہنیں، چھوٹے دادا صاحب کا فرزند کیسی زندگی افروز دنیا تھی! جسے انقلاب نے نقش موہوم بنا دیا... وہ چہل پہل، وہ میٹھے کنوؤں کا پانی، کڑوے تیل کا چراغ، وہ پسنہاریوں کا کاندھی چلکے ظروف (لٹھانوں) میں آٹا پیس کر لانا، وہ شہنشاہ اکبر کے

itsurdu.blogspot.com

نام سے مسکوک سکے، ایک ڈھل (پیسے) میں دو۔ وہ زندگی کی ارزانی، وہ فراغ
و آسودگی اور تکلفتہ سامانی!... اب وہ زمانہ خواب و خیال معلوم ہوتا ہے۔ وہ حقیقتیں
فسانہ ہوگئیں اور وہ زمانے بدل گئے۔"

اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مولانا محمد حسین صدیقی کا خاندان بھرا پورا آسودہ اور خوشحال تھا اور جس انقلاب کا حضرت سیماب نے ذکر کیا ہے وہ بزرگوں کی وفات اور آبائی مکان کی ملکیت سے محرومی کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے۔

○

پیدائش، بچپن، تعلیم، شاعری کی ابتدا

حضرت سیماب اکبرآبادی دوشنبہ 28 رجب المرجب 1299 ہجری مطابق 5 جون 1882 وقت صبح اکبرآباد (آگرہ) کے محلہ نائی منڈی، ککوگلی، املی والے مکان میں پیدا ہوئے۔ والدین نے ان کا نام شیخ عاشق حسین صدیقی رکھا۔ اپنے ہجری سال پیدائش کے تعلق سے انھوں نے 'کارامروز' میں یہ دلچسپ انکشاف کیا:

ستاسی سال بعدِ میر ہے تخلیق غالب کی
یہی وقفہ ہے میری اور غالب کی ولادت میں

میر تقی میر 1125 ہجری میں پیدا ہوئے۔ اس کے ستاسی سال بعد غالب 1212 ہجری میں پیدا ہوئے اور اس کے ستاسی سال بعد یعنی 1299 ہجری میں سیماب پیدا ہوئے۔

ان کے بچپن کی تفصیلات کہیں نہیں ملتیں البتہ ابتدائی تعلیم کے متعلق دستیاب تفاصیل سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مولانا محمد حسین نے اپنے بچے کی ابتدائی تعلیم میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی، انھوں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ ان کا بیٹا نہایت ذہین ہے اور عادات و اطوار کے معاملے میں عام بچوں سے مختلف بھی، حضرت سیماب کی ابتدائی تعلیم مروجہ دستور کے مطابق عربی اور فارسی سے شروع ہوئی۔ عربی ادب، اصول اور منطق کے ساتھ ساتھ فارسی میں سکندر نامہ، مینا بازار، مثنوی غنیمت، گلستان، بوستان، رقعات میرزا قتیل، سہ نثر ظہوری، ابوالفضل وغیرہ کتابیں انھیں مولانا جمال الدین سرحدی، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا قمرالدین اور مولانا عبدالغفور نے پڑھائیں۔ قرآن اور حدیث کا درس انھوں نے اپنے والد اور دو دیگر علما سے حاصل کیا۔ کم عمری میں ہی انھیں زبان و بیان اور علم عروض پر خاصا عبور حاصل ہوگیا تھا، اردو اور فارسی کے بے شمار اشعار انھیں ازبر تھے، ان کے والد کا ایک چھوٹا سا نجی کتب خانہ تھا جس سے وہ بہت فیضیاب ہوئے۔ اردو کے کلاسیکی ادب کا مطالعہ ان کا

itsurdu.blogspot.com

معمول تھا اور شعر و سخن میں ان کا بڑا جی لگتا تھا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب انگریزی تعلیم عام نہیں تھی لیکن حضرت سیماب کے والد اپنے بیٹے کو بہتر سے بہتر تعلیم دلوانے کے خواہاں تھے لہٰذا انھیں انگریزی اسکول میں داخلہ دلوا دیا جو گورنمنٹ کالج اجمیر سے تعلق اور الحاق کی وجہ سے برانچ اسکول کہلاتا تھا۔

اپنی غیر معمولی ذہانت سے انھوں نے برانچ اسکول کے مدارج درس بعجلت طے کر لیے اور اعلیٰ تعلیم کے لیے گورنمنٹ کالج میں شریک ہو گئے، جہاں انھیں مولوی سدید الدین قریشی اکبر آبادی، مولوی تحسین علی اجمیری اور مولوی عابد حسین جیسے عالم و فاضل استاد نصیب آئے۔ ان مشفق اساتذہ کی خصوصی توجہات نے ان کے ذوقِ شاعری کو بے حجاب کر دیا جو ان کی فطرت میں ازل سے ودیعت تھا۔ غیر معمولی فطری موزونیت نے اپنے پر پرزے نکالے۔ اب ان کا دستور یہ تھا کہ فارسی نصاب میں جتنے اشعار شریک درس ہوتے وہ ان سب کا اردو میں منظوم ترجمہ کر کے اپنے اساتذہ کو پیش کر دیتے۔ مقدس اور وسیع القلب اساتذہ پوری دلچسپی کے ساتھ ان کی اس 'جسارت' کی حوصلہ افزائی فرماتے، ان بزرگوں کی پذیرائی نے ایک فطری شاعر کی زمانۂ طالب علمی کی معصومیت کو راہ عطا کی۔ اس غیر معمولی سلسلے پر حضرت سیماب 'کلیم عجم' میں ایک دلچسپ واقعہ تحریر فرماتے ہیں:

"... مجھے خوب یاد ہے کہ مولوی عابد حسین کے سامنے جب میں نے ایک روز بوستان کی ایک حکایت کا ترجمہ منظوم پیش کیا تو مولوی صاحب نے میری کاپی کے اسی صفحے پر پنسل سے یہ شعر لکھ دیا:

جب نہیں ہے شعر کہنے کا شعور
پھر بھلا ہے شعر کہنا کیا ضرور

لیکن ساتھ ہی ساتھ متبسم ہو کر یہ بھی فرما دیا کہ کل پھر کسی فارسی نظم کا ترجمہ نظم ہی میں کر کے لانا۔ غرض اب یہ میری عادت جاریہ تھی کہ میں ہاتفی، جامی، سعدی، عرفی، قاآنی وغیرہ کے اشعار و قطعات کا ترجمہ (جن کا انتخاب کلام جزو نصاب تھا) ہمیشہ بصورتِ نظم پیش کیا کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ جسارت اتنی بڑھ گئی کہ امتحان کے پرچوں میں بھی ہمیشہ فارسی نظم کا ترجمہ اردو نظم ہی میں کرتا رہا اور صاحب ذوق ممتحن میری اس بدعت سے کبھی چیں بہ جبیں نہ ہوئے۔"

غرض کہ حضرت سیماب کی تعلیم اور مشق سخن کا سلسلہ رواں دواں رہا۔ ان کے والد محترم ابتدا میں ان کے شعری ذوق کے مخالف تھے۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ ان کا بیٹا اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرے لیکن قدرت نے تو ایک عظیم شاعر کی حیثیت سے روح سیماب کو منتخب کر لیا تھا۔ اب اپنے والد سے چھپ چھپا کر مشاعروں میں شرکت کیا کرتے تھے۔ جب کہیں مشاعرہ ہوتا تو وہ دعا کرتے تھے کہ خدا کرے ان کے والد کہیں وعظ کہنے چلے جائیں اور انھیں مشاعرے میں شرکت کا موقع مل جائے، اکثر یہ خواہش پوری بھی ہو جاتی تھی لیکن جب کبھی ایسا نہیں ہو پاتا وہ بے چینی سے رات بھر کروٹیں بدلتے رہتے۔ لیکن جب مولانا محمد حسین نے یہ محسوس کر لیا کہ ان کا شعری ذوق فطری اور موروثی ہے تو رفتہ رفتہ ان کا رویہ نرم ہو گیا اور اب وہ حضرت سیماب کی شاعری کے روشن مستقبل کے لیے دعائیں فرمانے لگے۔

حضرت سیماب نے 'کلیم عجم' میں نہ جانے کس رو میں اپنا سالِ پیدائش 1880 لکھا ہے اور آگے بھی وہ اس سہو کو برتتے چلے گئے حالانکہ ہجری تاریخوں کے مطابق ان کی تاریخ پیدائش وہی ہے جو میں نے اس باب کے آغاز میں تحریر کی ہے لہٰذا اگر سنین کی الجھنوں میں نہ پڑیں تب بھی دس بارہ برس کی عمر میں ان کی طبیعت شعر کہنے کی طرف مائل ہوئی (انھوں نے 1892 کے آس پاس کا زمانہ بتایا ہے)۔ کسی شخص کے شاعر ہو جانے کا پروسیس بڑا عجیب ہوتا ہے بلکہ یہ پروسیس ہر شاعر کے ساتھ مختلف النوع ہوتا ہے۔ حضرت سیماب کی فطری موزونیت کا ذکر تو میں کر چکا ہوں، ذرا خود ان کی زبانی اس پروسیس کا ماجرا ملاحظہ فرمائیں:

"جس وقت جو کتاب یا بیاض میرے سامنے آئی میں نے اس پر پنسل یا قلم سے ایک شعر لکھ دیا۔ یہ شعر فی الحقیقت ان سنے سنائے اشعار کا چربہ ہوتا تھا جو بیرونی فضا سے کسی نہ کسی طرح کانوں تک پہنچتے رہتے تھے یا جنھیں میں اپنی ابتدائی درسی کتابوں میں پڑھتا تھا۔ رفتہ رفتہ شعر کہنے سے ایک خاص قسم کی لذت حاصل ہونے لگی۔ یہ مجھے یاد نہیں کہ ان میں سب اشعار موزوں ہوتے تھے یا ناموزوں۔ لیکن میں نے بالمرہ ایک وقتِ خاص اس روحانی و جنسی لذت سے متکیف ہونے کے لیے مقرر کر لیا، اب میں اچھے کاغذ کی چھوٹی نفیس بیاض بنوا کر اس پر اپنے اشعار لکھنے لگا۔ قاعدہ یہ تھا کہ رات کو تمام کاموں سے فارغ ہو کر میں چراغ شمعدان پر رکھ لیتا اور فکر کرنے

itsurdu.blogspot.com

لگتا۔ جس زمین میں شعر کہتا اس کے تمام قوافی جو بقدرِ معلومات مجھے اس وقت یاد آتے پہلے ایک کاغذ پر لکھ لیتا اور پھر انھیں کی مناسبت سے شعر کہتا۔ اس زمانے میں شعر کے موزوں یا غیر موزوں ہونے کا سوال نہ تھا بلکہ یہ خبط تھا کہ کسی طرح شعر کہوں اور روز کہوں۔ یہ خبط بڑھتے بڑھتے بتدریج ذوق میں تبدیل ہوگیا۔"

پندرہ سولہ سال کی عمر تک یہی عالم رہا۔ وہ ہر سال محرم منانے کے لیے اپنی والدہ ماجدہ کے ساتھ اجمیر سے آگرہ آتے تھے اور محرم کی ساتویں تاریخ کو اپنے محلے کے عزہ خانے میں شہدائے کربلا کو اپنے اشعار کے ذریعے خراج عقیدت پیش کرتے تھے، گو کہ ان اشعار میں لڑکپن کی ناتجربہ کاری تھی لیکن ایک فطری شاعر کی نشوونما کے لیے یہ تمام افعال بے حد کارآمد ثابت ہوئے۔ ان کے اس دور کی کوئی غزل محفوظ نہیں رہ سکی۔ دریں اثنا انھوں نے اردو، فارسی اور عربی کے ساتھ ساتھ ہندی اور سنسکرت میں بھی مہارت حاصل کر لی تھی جب کہ انگریزی میں تعلیم حاصل کرنے کی وجہ سے اس کے ادب عالیہ اور زبان کی باریکیوں پر بھی کمال حاصل کر لیا تھا۔ اس طرح کئی زبانوں پر عبور نے ان کے ذہن و فکر کو نئی سمتیں اور وسعتیں عطا کر دی تھیں۔ ان کے عہد کے معدودِ چند اردو شعرا ہی اس طرح کی لیاقت کے حامل تھے اور دیگر اوصاف کے ساتھ ساتھ اس وصف نے بھی حضرتِ سیماب کو آگے چل کر ممتاز حیثیت حاصل کرنے میں معاونت کی، ان زبانوں سے واقفیت کا ذکر ان کے چھوٹے فرزند مظہر صدیقی مرحوم نے بھی کیا ہے۔ (لوحِ محفوظ، ناشر: سیماب اکادمی پاکستان، مطبوعہ نومبر 1983، صفحہ 6)

غالباً زمانۂ طالب علمی ہی میں انھوں نے 'سیماب' تخلص اختیار کر لیا تھا۔ ان کے تخلص کے تعلق سے ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ نہ صرف ان کے مزاج سے مطابقت رکھتا ہے بلکہ اچھوتا بھی ہے کیوں کہ ان سے قبل شاید ہی کسی شاعر کا تخلص سیماب رہا ہو۔ اس سے ان کی جدت پسندی کا اندازہ ہوتا ہے۔

ابھی وہ ایف اے کے آخری سال میں ہی تھے کہ والدِ محترم کی علالت اور انتقال کے سبب تعلیم کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔

○

ملازمت، شادی، اولاد

مولانا محمد حسین صدیقی کی علالت، آگرہ منتقلی اور وفات سے حضرت سیماب اکبرآبادی کی زندگی میں ایک انقلاب آگیا۔ چوں کہ وہ فرزند اکبر تھے لہٰذا والدہ، دو بھائیوں اور دو بہنوں کی کفالت پرورش اور گھریلو اخراجات کی پوری ذمے داری ان کے کاندھوں پر آپڑی جب کہ ان کی عمر اس وقت صرف سولہ سترہ سال رہی ہوگی۔ ایف اے کے آخری سال کا امتحان بھی نہیں دے سکے۔ مولانا محمد حسین کی کتابوں (خصوصاً گلدستۂ عطار) کی ان دنوں خاصی کھپت تھی، کچھ دنوں تک تو ان کتابوں کی فروخت سے ہی خاندان کی گزر بسر ہوتی رہی لیکن یہ کوئی مستقل ذریعۂ آمدنی نہ تھا اور ایک بڑے خاندان کی کفالت کے لیے ناکافی تھا۔ بالآخر انھیں ملازمت کرنی پڑی۔ ان کے شاگرد رشید ضیا فتح آبادی لکھتے ہیں:

"آگرہ میں سیٹھ چھوٹانی کی نال پر چند روز ملازمت کرنے کے بعد وہ کانپور میں شیخ عبدالرزاق کیشن ایجنٹ کے یہاں ملازم ہوگئے وہاں ایک برس کام کرنے کے بعد واپس آگرہ آگئے۔"

(ذکرِ سیماب۔ طابع: بزمِ سیماب دہلی، مطبوعہ: جنوری 1984)

1898 کے اواخر میں وہ دوبارہ کانپور گئے جہاں ان کے اولین شاگرد منشی امیرالدین نظر وارثی اکبرآبادی نارتھ ویسٹ ٹیجری میں مستری کے کام پر معمور تھے۔ اسی کارخانے میں بطور فیکٹری کلرک حضرت سیماب ملازم ہوگئے۔ بقول ضیا فتح آبادی دونوں، استاد اور شاگرد ایک ہی مکان میں سکونت پذیر تھے جو گوال ٹولی میں واقع تھا۔

اندازہ ہوتا ہے کہ دوسری بار کانپور جانے سے قبل ہی آگرہ میں ان کی شادی ہوگئی تھی۔ ان کی زوجۂ محترمہ سکینہ خاتون ملا امام الدین (رئیس حویلی بشیر خاں۔ آگرہ) کی دختر تھیں۔ حضرت سیماب اکبرآبادی کے فرزند اور جانشین اعجاز صدیقی مرحوم نے ضیا فتح آبادی

itsurdu.blogspot.com

کو ایک مکتوب میں اس خاندان کا تعارف یوں پیش کیا ہے:

"یہ خاندان بہت متمول تھا۔ کلاہتوں کی تجارت ہوتی تھی۔ ایک لاکھ روپے کے چبوترے پر ہمیشہ چراغ جلتا رہتا۔ بے تحاشا جائداد چھوڑی۔"

(مکتوب مورخہ 14 اگست 1975 ممبئی)

حضرت سیماب اکبرآبادی کے چار بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ بڑی بیٹی حسینہ خاتون کی وفات 1919 میں ہوئی جب کہ دوسری بیٹی 1906 میں پیدا ہوئیں، ان کا نام جمیلہ خاتون تھا، بی بی اینڈ سی آئی ریلوے میں گارڈ کی حیثیت سے ملازمت کرنے والے امیرالدین حیدر سے ان کی شادی کر دی گئی تھی، جمیلہ خاتون نے 9 اگست 1937 میں وفات پائی۔

ان کے بڑے فرزند شمشاد حسین صدیقی، منظر تخلص فرماتے تھے، گوکہ تمام عمر خرابی صحت کے شکار رہے لیکن حضرت سیماب کے معاون کی حیثیت سے ان کے ساتھ خاصا کام کیا، شعر کہنے کا سلیقہ موروثی تھا، نظم و نثر دونوں میں طبع آزمائی کی، عروض پر بھی ایک مختصر کتاب لکھی، رسالہ 'شاعر' کے ابتدائی دو تین برسوں تک اس کے مدیر رہے۔ 1935 میں آگرہ سے ماہنامہ 'کنول' جاری کیا مگر یہ رسالہ زیادہ عمر نہیں پا سکا۔ منظر مرحوم 1909 کو کانپور میں پیدا ہوئے، تقسیم ہند کے بعد کراچی منتقل ہو گئے اور وہیں 2 اکتوبر 1971 میں وفات پائی۔

حضرت سیماب کے دوسرے بیٹے اعجاز حسین صدیقی صحیح معنوں میں ان کے جانشین ہوئے، اعجاز تخلص تھا، 1912 کو آگرہ میں پیدا ہوئے۔ معقول تعلیم حاصل کی، اردو، عربی، فارسی اور انگریزی زبانوں پر عبور حاصل تھا، غزل، نظم، تحقیق، تنقید، اصلاح سخن، مذہب کی پابندی، پاسداری، غرض کہ ہر وہ خصوصیت جو حضرت سیماب میں تھی اس کا کچھ نہ کچھ اثر اعجاز صدیقی مرحوم میں موجود تھا۔ 1935 سے وہ رسالہ 'شاعر' کے مدیر ہوئے اور تاحیات اپنے والد کے اس چراغ کو روشن رکھا، گوکہ معاشی حالات کبھی بھی بہت اچھے نہیں رہے لیکن ماہنامہ 'شاعر' کو ہر حال میں جاری رکھنا ان کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ نثر اور نظم دونوں میں بہت کام کیا لیکن وہ سب 'شاعر' اور دیگر رسائل کے صفحات میں بکھرا ہوا ہے۔ کتابی صورت میں ان کی نظموں کے صرف دو مجموعے شائع ہوئے۔ 'خوابوں کا مسیحا' طویل نظم ہے

جو اردو، انگریزی اور ہندی تینوں زبانوں میں یکجا، کتابی صورت میں ان کی حیات ہی میں شائع ہوئی اور ان کی وفات کے بعد فروری 1979 میں ان کی نظموں کا مجموعہ 'کرب خود کلامی' شائع ہوا۔ باوجود اس کے کہ ان کا پورا خاندان تقسیم ہند کے بعد پاکستان چلا گیا تھا، اعجاز صدیقی مرحوم نے ہندوستان ہی میں رہنا پسند کیا۔ 1951 میں حضرت سیماب کی وفات کے بعد وہ آگرہ سے بمبئی ہجرت کر گئے۔ اردو کے لیے تاعمر مجاہدہ کیا، مہاراشٹر میں اردو اکادمی کے قیام کی تحریک ان کا ایک اور اہم کارنامہ ہے۔ افسوس کہ زبان اور ادب کے فروغ کے لیے اپنی پوری زندگی وقف کر دینے والے اس مجاہد اردو کو فراموش کر دیا گیا۔ خانوادۂ سیماب میں صرف اعجاز صدیقی مرحوم ہی کے بیٹوں نے حضرت سیماب کی ادبی وراثت کو باقی رکھا۔ ان کے بڑے فرزند تاجدار احتشام صدیقی مرحوم اچھے افسانہ نویس اور طنز و مزاح نگار تھے۔ ان کے خطوط اور نثری نظمیں بھی ادب کا وقیع سرمایہ ہیں۔ اعجاز صدیقی مرحوم کی وفات (9 فروری 1978 بمقام بمبئی) کے بعد تاجدار مرحوم 'شاعر' کے مدیر اعلیٰ ہوئے۔ 4 فروری 1981 کو دہران (سعودی عرب) میں ان کا انتقال ہوا۔ اعجاز صدیقی مرحوم کے دوسرے بیٹے ناظر نعمان صدیقی زمانۂ طالب علمی سے ہی 'شاعر' اور مکتبہ قصرالادب کے انتظامی امور میں اپنے والد کے معاون رہے اور تاحال 'شاعر' کی سلیقگی اشاعت ان کی محنت، لگن اور ایثار کا ثمر ہے۔ اعجاز مرحوم کے تیسرے فرزند افتخار امام صدیقی جو جانشین سیماب و اعجاز ہیں نہ صرف ماہنامہ شاعر کے مدیر ہیں بلکہ اپنی نثری اور شعری صلاحیتوں کے سبب عصر حاضر کے ادبا، شعرا اور صحافیوں میں امتیازی مقام رکھتے ہیں۔ تین فرزندان رئیس مُغنی صدیقی، کمال اختر صدیقی اور شعیب انور صدیقی کا تعلق زبان و ادب سے تو نہیں ہے لیکن شستہ ادبی ذوق کے علاوہ اپنے اپنے میدانوں میں نامور ہیں۔ رہ گیا یہ خاکسار حامد اقبال صدیقی۔ تو عرض کر دوں کہ اللہ نے دادا مرحوم سیماب اکبرآبادی اور والد مرحوم اعجاز صدیقی کے خاندان میں پیدا کیا۔ یہی میرے لیے باعث افتخار ہے، شعر کہتا ہوں اور تھوڑا بہت نثری کام کیا ہے اور بس...! اعجاز صدیقی مرحوم کی دو بیٹیاں ہیں۔ بڑی بیٹی ثروت انتقال فرما چکی ہیں اور چھوٹی بیٹی ثریا جبین کراچی میں مقیم ہیں۔

itsurdu.blogspot.com

حضرت سیماب کے تیسرے فرزند سجاد حسین صدیقی 1917 کو پیدا ہوئے۔ اچھا ادبی ذوق رکھتے تھے لیکن تخلیقی ادب سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ حافظ قرآن تھے۔ وہ ایک اچھے آرٹسٹ کے روپ میں ابھرے۔ کراچی میں حضرت سیماب کا قائم کردہ 'پرچم پرنٹنگ پریس، چلاتے تھے وہیں 1967 میں انتقال فرمایا۔

مظہر حسین صدیقی، حضرت سیماب اکبرآبادی کے سب سے چھوٹے فرزند تھے۔ ان کا انتقال کراچی میں ہوا۔ انھوں نے سیماب اکادمی پاکستان قائم کی اور حضرت سیماب کی کئی کتابیں بشمول وحی منظوم اسی ادارے سے شائع کیں۔ کراچی میں حضرت سیماب کے زیر سرپرستی ہفت روزہ 'پرچم' جاری کیا لیکن یہ جریدہ دو برس سے زیادہ نہ رہ سکا۔ انھوں نے ابتدائی دنوں میں افسانے بھی لکھے۔

خانوادۂ سیماب کی علمی اور ادبی خدمات ایک بڑا موضوع ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ سیماب اور خانوادۂ سیماب کی ان خدمات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

○

تلمذ

جس دور میں حضرت سیماب اکبرآبادی نے شعر گوئی کی ابتدا کی، فن شاعری میں اصلاح سخن کا عام رواج تھا۔ ہر مبتدی کسی نہ کسی استاد کے آگے زانوے ادب تہ کرتا۔ یہ حقیقت ہے کہ اس دور میں زبان اور عروض کے کاملان فن کی ایک بہت بڑی تعداد موجود تھی۔ یہ اور بات ہے کہ 1857 کی پہلی جنگ آزادی کے بعد سے ملک کے حالات میں جو انقلاب برپا ہوا تھا اس کا اثر سماج کے ہر شعبے پر پڑا لہٰذا علوم وفنون پر بھی یہ حالات کافی حد تک اثر انداز ہوئے اور شاعری میں بھی فرسودہ رواج کے خلاف بیداری کا رجحان پیدا ہونے لگا تھا اور اب استادی اور شاگردی کے رشتے میں پہلا سا تقدس کچھ کچھ ماند پڑنے لگا تھا لیکن تب بھی اصلاح سخن یا مشورۂ سخن کا سلسلہ جاری تھا۔

زمانۂ طالب علمی میں اجمیر میں حضرت سیماب شعر تو کہنے لگے تھے لیکن کسی کامل فن سے اصلاح سخن کا سلسلہ شروع نہیں ہوا تھا۔ راز چاند پوری مرحوم نے 'داستان چند' میں 'واقعات سیماب' مؤلفہ قاسم علی خان قادری مارہروی سے چند اقتباسات نقل کئے ہیں، یہ قلمی تذکرہ اعجاز صدیقی مرحوم کے پاس محفوظ تھا لیکن اب شاید ضائع ہوگیا۔ یہاں ایک اقتباس نقل کرنا چاہتا ہوں لیکن اس سے قبل عرض کردوں کہ حضرت سیماب نے ابتدا میں اجمیر اور آگرہ کے بعض شعرا سے مشورۂ سخن ضرور کیا لیکن باضابطہ کسی کے شاگرد نہیں ہوئے۔ قادری صاحب لکھتے ہیں:

> "سیماب صاحب کبھی کبھی خاک (اجمیری) صاحب کی دکان پر مل بازار میں جاکر بیٹھتے تھے۔ خاک صاحب کو ان کے ذوق شاعری سے شغف تھا، وہ سمجھتے تھے کہ ان میں صلاحیت شاعرانہ بدرجۂ اتم موجود ہے۔ ایک روز جب سیماب صاحب نے خاک صاحب کو اپنی ایک غزل سنائی جس کا مطلع تھا:

itsurdu.blogspot.com

حیرت میں ہے قمر ترا دیدار دیکھ کر
چکرا رہا ہے چرخ بھی رفتار دیکھ کر

تو حضرت خاک نے ان کی غزل لے کر اس پر یہ شعر لکھ دیا:

سیماب شعر کہنے کا گر شوق ہے تمہیں
استاد بھی کرو کوئی اے یار دیکھ کر

حضرتِ خاک کے اس شعر سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سیماب صاحب ان کے باقاعدہ شاگرد نہ تھے۔ محمد حسین خاک اجمیری جو تلمیذ غالب کلیم اجمیری کے شاگرد تھے، اجمیر میں ایک پرگو اور کہنہ مشق شاعر کی حیثیت سے خاصے مشہور تھے اور ان کے شاگردوں کی فہرست بھی کافی طویل تھی۔ وقت کی کروٹیں بھی عجیب ہوتی ہیں آج حضرتِ خاک کو کوئی نہیں جانتا اور حضرت سیماب کا نام آج بھی روشن ہے۔

اس کے علاوہ حضرتِ سیماب نے ابتدائی دنوں میں دیگر شعرا سے بھی مشورۂ سخن کیا لیکن ان میں سے کسی کے بھی شاگرد نہیں ہوئے۔ یہ اور بات ہے کہ جب خود حضرت سیماب کی شہرت ہوئی تو لوگوں نے ان کے تلمذ کو بھی ایک موضوع بنالیا اور حضرتِ خاک اجمیری کے علاوہ حضرتِ ازل عظیم آبادی اور حضرتِ افسوں شاہ جہاں پوری کے نام بھی سامنے لائے گئے۔ حکیم شیخ حسن مہدی ازل عظیم آبادی، حضرت جلال لکھنوی کے شاگرد تھے اور کانپور میں مقیم تھے جب کہ افسوں شاہ جہاں پوری داغ کے شاگرد تھے اور کچھ عرصے تک آگرہ میں قیام پذیر تھے۔

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ماضی میں کئی اہم شعرا کی ایسی مثالیں مل جاتی ہیں کہ انھوں نے ابتدائی دنوں میں مختلف شعرا سے مشورۂ سخن کیا اور پھر کسی ایک کو اپنا استاد تسلیم کر لیا۔ راز چاند پوری نے چند مثالیں بھی پیش کی ہیں جیسے حضرت قائم چاند پوری نے مرزا سودا کا شاگرد ہونے سے قبل شاہ ہدایت اور میر درد سے مشورۂ سخن کیا۔ حضرت نوح ناروی جو داغ دہلوی کے عزیز ترین شاگردوں میں سے تھے اور کچھ لوگ انھیں جانشینِ داغ بھی کہتے ہیں لیکن انھوں نے داغ کے دامنِ ادب سے وابستہ ہونے سے قبل میر نجف علی، امیر مینائی اور جلال لکھنوی سے فیضِ اصلاح حاصل کیا۔ حضرتِ سیماب خود نہایت رکھ رکھاؤ

والے شخص تھے، بزرگوں کا احترام کرنا جانتے تھے اور چوں کہ خود سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں شعرا کے استاد تھے لہٰذا استاد کی اہمیت کو جانتے تھے، انھوں نے کہیں بھی ان تینوں بزرگ شعرا میں سے کسی کا باقاعدہ شاگرد ہونا تحریر نہیں کیا۔

حضرتِ سیماب اکبرآبادی کے قیام اجمیر میں ان کی ملاقاتیں کئی اساتذۂ سخن سے تھیں ان میں منشی نظیر حسن سخا دہلوی بھی تھے جو داغ کے شاگرد تھے۔ حضرت سخا سے شعر و سخن کے موضوع پر حضرتِ سیماب کی خاصی گفتگو رہتی، سخا یہ محسوس کر چکے تھے کہ اس نوجوان میں شاعری کی بے پناہ صلاحیت ہے لہٰذا وہ اکثر حضرت سیماب سے اصرار کرتے کہ یا تو وہ ان کے شاگرد ہو جائیں یا کوشش کر کے مرزا داغ کے تلامذہ میں شامل ہو جائیں، غالباً وہ سخا صاحب کو اپنا استاد بنانا نہیں چاہتے تھے یا پھر یہ کہ قدرت کو یہ منظور تھا کہ وہ فصیح الملک مرزا داغ دہلوی کے شاگرد ہوں لہٰذا سخا صاحب کی پیش کش قبول نہیں ہوئی۔

کانپور میں نارتھ ویسٹرن ٹمبیری میں ملازمت کی ابتدا میں یعنی 1898 میں ہی ایک دلچسپ اتفاق ہوا، مرزا داغ، ایک مرتبہ کسی رئیسِ دکن کے ساتھ دہلی گئے اور واپسی میں کانپور سے گزرے۔ حضرتِ سخا بھی ان کے ساتھ تھے چوں کہ وہ حضرت سیماب کی شعری صلاحیتوں سے واقف تھے اور مخلص تھے اس لیے موقع غنیمت جان کر فوراً حضرتِ سیماب کو مرزا داغ کی آمد کی اطلاع دی اور وہ مقررہ وقت پر ریلوے اسٹیشن پہنچ گئے۔ حضرت داغ نے انھیں سیلون میں بلوایا اور بیٹھنے کی اجازت دی اور کہا کہ "سخا صاحب نے مجھ سے آپ کی بہت سفارش کی ہے اور آپ کے دیرینہ ارمان تلمذ کا بھی ذکر کیا ہے۔" پھر حضرتِ سیماب کو حکم دیا کہ وہ کوئی غزل سنائیں، انھوں نے اپنی نئی غزل جو "بن کے بیٹھے ہیں۔ تن کے بیٹھے ہیں" کی زمین میں کہی تھی وہ سنائی۔ حضرت داغ ہنسے اور فرمایا کہ "واہ صاحب زادے پہلی غزل اپنے ہونے والے استاد کی زمین میں کہہ ڈالی۔" پھر فرمایا کہ "اچھا، اصلاح کے لیے آپ غزلیں مجھے حیدرآباد بھیج سکتے ہیں۔ میں آپ کا نام فہرستِ تلامذہ میں لکھا دوں گا۔"

'شعر الحیات' میں حضرت سیماب نے زمانہ قیام کانپور کے تعلق سے تحریر فرمایا ہے:

itsurdu.blogspot.com

"... حکیم ازل لکھنوی، جناب محب لکھنوی اور کانپور کے اکثر شعرا سے مجالست رہی۔ اس زمانے میں وہاں حکیم سید ضامن علی جلال لکھنوی کا طوطی بول رہا تھا اور کانپور لکھنؤ کے زیرِ اثر تھا۔ لیکن میری طبیعت فطرتاً دبستان دہلی کی طرف مائل تھی اس لیے میں 1898 میں فصیح الملک حضرت داغ دہلوی کا شاگرد ہوگیا۔"

حضرتِ سیماب فصیح الملک داغ دہلوی کے شاگرد ہوگئے لیکن فیضِ تلمذ سے کچھ عرصے تک محرومی رہی تھی۔ انھوں نے 'شعرالحیات' میں مزید لکھا ہے:

"1898 میں حیدرآباد سے برادر محترم نواب سراج الدین احمد خاں سائل دہلوی مرحوم کی ادارت میں رسالہ 'معیارالانشاء' شائع ہوتا تھا۔ نواب فصیح الملک کے حکم سے میں اس کا خریدار ہوا اور غزلیں بغرض اصلاح حیدرآباد بھیجنے لگا لیکن دوسری یا تیسری غزل پر فصیح الملک مرحوم نے لکھ دیا کہ "ابھی آپ کو مشق کی ضرورت ہے۔" اس تنبیہ کے بعد میں نے غزلوں کی ترسیل کچھ عرصے کے لیے بند کردی اور مشقِ سخن کی طرف متوجہ ہوگیا۔"

اور اس حیرت انگیز مشقِ سخن کے تعلق سے انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ نئی نسل کے ان شعرا کے لیے یقیناً عبرت کا باعث ہوگا جو دس بیس غزلیں کہہ لینے کے بعد نہ صرف مشاعروں کے حصول کی تگ و دو میں لگ جاتے ہیں بلکہ معاصر رسائل میں نمایاں مقام پر چھپنے اور اہم شعرا میں گردانے جانے کے خواہاں ہوتے ہیں:

"اب میرا دستورالعمل یہ تھا کہ میں صبح سے شام تک بادامی کاغذ کا ایک دستہ اشعار سے سیاہ کردیا کرتا تھا اور یہ دفترِ بے معنی شام کو پھاڑ کر نالی میں بہا دیتا تھا۔ کئی ماہ تک یہ سلسلۂ مشق اسی طرح جاری رہا..."

اتنی شدید مشقِ سخن کا پھل تو ملنا ہی تھا۔ ایک مرتبہ مول گنج کانپور میں ایک مشاعرے کا اعلان ہوا۔ مصرع طرح کے قوافی اور ردیف "دم نکلتا ہے۔ کم نکلتا ہے" تھے۔ حضرت سیماب نے بھی اس زمین میں ایک غزل کہی اور بغرض اصلاح استادِ محترم مرزا داغ کی خدمت میں حیدرآباد بھیج دی۔ جب اصلاح کے بعد غزل واپس آئی تو اس غزل کی پیشانی پر جو کچھ لکھا ہوا تھا وہ حضرت سیماب کے لیے حوصلوں کا سورج ثابت ہوا۔ غزل کی پیشانی پر استاد نے سرخ روشنائی سے تحریر فرمایا تھا: "آفریں ہے۔ کیا خوب غزل کہی ہے۔" اس سے

پہلے وہ مشاعروں میں شرکت کرتے ہوئے جھجکتے تھے لیکن اب ان کے حوصلے بڑھ گئے اور طبیعت کی جھجک ختم ہوگئی۔ اب وہ کانپور اور لکھنؤ کے مشاعروں میں بے تکلف شریک ہونے لگے۔

اصلاحِ سخن کا یہ سلسلہ حضرتِ داغ کی وفات یعنی فروری 1905 تک جاری رہا۔ اس کے بعد حضرت سیماب نے پھر کسی کو اپنی غزلیں بغرض اصلاح نہیں دکھائیں۔

اب یہاں اس قضیے کا ذکر بھی ضروری سمجھتا ہوں جو حضرتِ سیماب پر کام کرنے والوں کے لیے الجھن کا باعث رہتا ہے۔ حضرت ابراحسنی گنوری اور چند دیگر لوگوں نے جن میں مولانا حامد حسن قادری بھی شامل تھے، حضرتِ سیماب کی بے پناہ شہرتوں سے متاثر ہوکر ایک اعتراض تلاش کیا کہ حضرتِ سیماب فصیح الملک داغ دہلوی کے شاگرد نہیں تھے۔ یہ صد احترام بزرگ محض سنی سنائی روایتوں کی بنیاد پر ملک کے چند چھوٹے موٹے ادبی رسائل میں اس بحث کو اچھالتے رہے۔ یہ اس دور کی بات ہے جب حضرتِ سیماب کے گرد شاگردوں کا ایک ہجوم تھا۔ ان بزرگوں کی ہمنوائی میں وہ شعرا بھی اٹھ کھڑے ہوئے جو بہ زعمِ خود استادِ سخن تھے اور تلامذہ کے خواہاں تھے۔ چوں کہ یہ بحث سنے سنائے شواہد پر مبنی تھی لہٰذا اپنی موت آپ مرگئی لیکن بدقسمتی سے حضرتِ سیماب کے تذکرہ نگار اسی میں الجھ کر رہ گئے۔ تلامذہ سیماب جن میں حضرت راز چاندپوری اور حضرت ضیا فتح آبادی بھی شامل ہیں، اس بحث میں ایسے الجھے کہ حضرتِ سیماب کی ادبی خدمات پر بہت کم کام کرسکے۔

میں یہاں مذکورہ بحث کی تفصیل میں جانے کے بجائے تلمذِ داغ کے چند شواہد پر ہی قناعت کروں گا کیونکہ میرے نزدیک اب اس معاملے کو پھر ایک بار ابھارنا نہ صرف وقت ضائع کرنا ہے بلکہ کسی قدر مضحکہ خیز اور احمقانہ بھی کیونکہ حضرت سیماب کے تلمذ داغ سے نہ حضرت داغ کی عظمت میں کوئی اضافہ ہوگا اور نہ ہی حضرت سیماب کا ادبی قد بلند ہوگا۔ سردست اتنا عرض کردوں کہ ان کے ادبی کاموں کا کینوس اتنا وسیع ہے کہ حضرت داغ کی شاگردی کا ذکر میرے نزدیک زیبِ داستان سے زیادہ اہم نہیں۔ ہاں! البتہ بدخواہوں کے لیے چند شواہد پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

itsurdu.blogspot.com

"خم خانۂ جاوید" مؤلفہ لالہ سری رام جلد چہارم (مطبوعہ دہلی پرنٹنگ پریس 1917) کا ایک اقتباس دیکھیں:

> "ادیب الشعرا ابوالفخر مولانا مولوی شیخ عاشق حسین صاحب سیماب صدیقی الوارثی 1881(؟) میں پیدا ہوئے۔ پہلے منشی افسوں شاگرد داغ سے مشورہ کرتے تھے 1901 (؟) میں فصیح الملک مرزا داغ سے تلمذ کیا۔ اجمیر میں رسالہ 'فانوس خیال' کی ادارت کی۔ جانشینی داغ کے مدعی نہیں۔"

حضرت ابراحسنی، حضرت احسن مارہروی کے شاگرد تھے جو تلامذۂ داغ میں نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ احسن مرحوم نے ایک نہایت ہی اہم مضمون 'مرزا داغ اور ان کے نورتن' تحریر فرمایا تھا جو تلامذۂ داغ کے موضوع پر کام کرنے والوں کے لیے خاصہ اہم ہے۔ یہ مضمون ماہنامہ 'شاعر' کے سالنامہ 1937 میں شائع ہوا تھا۔ حضرت احسن سیماب کے تعلق سے لکھتے ہیں:

> "وہ اور مقالہ نگار ایک ہی استاد کے چشمۂ فیض سے سیراب ہوئے ہیں 1898 میں آپ کو جہاں استاد سے بذریعۂ خط و کتابت شرف تلمذ حاصل ہوا۔ آپ تمام تلامذۂ فصیح الملک میں ایسے فرد وحید ہیں کہ مدتِ مدید ہی سے شعر و سخن میں اپنا پورا وقت صرف کرتے ہیں۔"

مذکورہ مضمون میں حضرت احسن نے انہیں داغ کے نورتنوں میں شمار فرمایا حالاں کہ حضرت سیماب نے خود کبھی نورتنوں میں سے ایک ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔

اس موضوع پر اب تک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ ضمناً عرض کردوں کہ اس قسم کی ایک بحث انجمن ترقی اردو ہند کے اخبار 'ہماری زبان' میں نومبر 1967 سے مئی 1968 تک جاری رہی۔ ڈاکٹر اقبال اور حضرت سیماب فصیح الملک کے دو ایسے شاگرد ہیں جنھوں نے استاد کے رنگِ سخن سے الگ اپنا مخصوص لب و لہجہ بنایا ورنہ ان کے سبھی شاگرد ان کے جیسے ہی شعر کہتے رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آج ان سبھی میں اقبال اور ان کے بعد سیماب کو جو شہرتیں نصیب آئیں، کسی اور کو میسر نہ ہوئیں۔

نواب سراج الدین سائل دہلوی جو فصیح الملک کے داماد تھے اور نہ صرف ان کے عزیز

ترین شاگرد تھے بلکہ جانشینِ حقیقی بھی تھے۔ ان کے دو اقتباسات ذیل میں نقل کرکے اس باب کو ختم کرنا چاہتا ہوں پہلا اقتباس اس مکتوب سے ہے جو انھوں نے حضرت نوح ناروی کو لکھا تھا، یہ مکتوب رسالہ "مشہور" دہلی (مطبوعہ دسمبر 1945) میں شائع ہوا تھا:

> "میں تم چار ہستیوں کو جتنا عزیز رکھتا ہوں اسے میرا دل ہی جانتا ہے۔ نمبروں کی ترتیب درجہ قائم کرتی ہے۔ تم (نوح)، بے خود، جوش ملسیانی، سیماب اکبرآبادی..."

حضرت سائل کا ایک اور مکتوب 'شاعر' کے آگرہ اسکول نمبر (مطبوعہ 1937) میں شائع ہوا ہے جو انھوں نے 22 اپریل 1937 کو تحریر فرمایا، جس میں انھوں نے حضرت سیماب اکبرآبادی کو 'یادگار جہاں استاد نواب فصیح الملک، داغ دہلوی' اور 'برادرِ عزیز' جیسے القاب سے مخاطب کیا ہے، لکھتے ہیں:

> "... اس مضمون کو میں ختم کرنا چاہتا ہوں سیماب بھائی کو معزز خطاب جانشینِ داغ دے کر جس کا مجھے حق حاصل ہے کہ جہاں استاد فصیح الملک داغ دہلوی مرحوم کے سلسلۂ تلامذہ میں وہ منصب رکھتا ہوں جو ان کے کسی شاگرد کو میسر نہیں ہے خواہ بروئے فن اکثر ان میں مجھ سے افضل و اعلیٰ ہی کیوں نہ ہوں۔ استاد مرحوم کے شاگرد جو سیماب صاحب کو جانشین استاد کے خطاب سے مخاطب نہ کریں گے ان سے مجھے شکایت ہوگی۔ میری شکایت ان کی حقارت ہوگی۔"

○

itsurdu.blogspot.com

بیعت

مذہبی مزاج کے حامل حضرتِ سیماب اکبرآبادی روحانیت سے خود کو بہت قریب پاتے تھے۔ ان کی سیمابی فطرت مادیت کے برتاؤ سے بے چین رہتی تھی اور اس بے چینی کو کسی روحانی رہبر کی تلاش تھی۔ کانپور میں پہلی بار جب انھوں نے قیام کیا تو ان کے ساتھ ان کے اولین شاگرد نظر اکبرآبادی بھی تھے۔ نظر صاحب حضرت حاجی سید شاہ وارث علی صاحبؒ کے مرید تھے اور اکثر ان کی خانقاہِ عالیہ واقع دیوہ شریف، ضلع بارہ بنکی پر حاضری دیا کرتے تھے۔ انھوں نے حضرتِ سیماب کو اپنے پیر و مرشد کے متعلق جو کچھ بتایا اس سے ان کے دل میں بھی اشتیاق پیدا ہوا کہ ایسی بزرگ ہستی سے نیاز حاصل کیا جائے۔ ایک دن دیوہ شریف جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں حضرتِ سیماب نے مرشدی و مولائی وارث پاکؒ کے دستِ مبارک پر بیعت کا شرف حاصل کیا۔ 'شاعر' کے 'کارِ امروز نمبر' (مطبوعہ جولائی 1935) سے اس سلسلے کا ایک واقعہ منقول ہے:

"سیماب محوِ رازِ بیعت دفعتاً بے ہوش ہوگئے اور جب ہوش میں آئے تو اضطرابِ شوق سے بے چین تھے، لیکن حضورِ سرکار میں دوبارہ حاضری مراسمِ ادب و احترام کے منافی تھی۔ گرِ شعریت کے قربان کہ جہاں دنیا کی کوئی قوت کام نہ کرسکے وہاں یہ کامیاب ہوجائے۔ کسی نے مولانا کو یاد دلایا کہ آپ شاعر بھی تو ہیں، ایک نظم کہیے اطلاع کردی جائے گی اور اس طرح آپ کی آرزوئے بازدید کامیاب ہوجائے گی، فوراً آپ نے ایک نظم کہی جس کا مطلع یہ تھا:

ساقیا دے مجھے وہ جامِ ولائے وارث
جس طرف آنکھ اٹھاؤں نظر آئے وارث

قدم بوسی کی اجازت دوبارہ مرحمت فرمائی گئی۔ عقیدت مند ایک فاتح شاعر کی حیثیت سے حاضرِ دربار ہوا۔ نذرِ عقیدت پیش کی۔ عنوانِ نظم کے بعد تمغۂ فصیح الملک

مرزا داغ دہلوی لکھا ہوا تھا۔ سرکار نے نظم کو خود پڑھا اور کاغذ موڑ کر سیدھے پائے مبارک کے انگوٹھے کے نیچے دبالیا۔ ایک لمحے کے بعد پھر پڑھا اور اپنے خادمِ خصوصی اوگھٹ شاہ صاحب سے ارشاد فرمایا "یہ فصیح ہیں" جواب میں کہا گیا کہ "سرکار فصیح الملک کے شاگرد ہیں۔" سرکار پر غلبۂ جذب طاری ہوا اور جوش میں آکر فرمایا "ہاں یہ فصیح ہیں"..."

یہ واقعہ 1899 کا ہے اور مذکورہ نظم (غزل) 'کلیمِ عجم' میں شامل ہے، اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے خود حضرتِ سیماب 'شعرالحیات' میں لکھتے ہیں:

"...مرشد کا ارشاد، خدا کا کرم، ادھر 'فصیح' کا خطاب ملا، ادھر گویا شاعری کے چودہ طبق روشن ہوگئے۔"

حضرت سیماب کے لیے جہانِ وارث سے وابستگی تا حیات باعثِ افتخار رہی لہٰذا انھوں نے سیماب کے علاوہ بعض غزلوں میں 'وارثی' تخلص بھی فرمایا مثلاً:

تمام شعبدے وارثی ہیں فقط نشاطِ نظر مری
نہ خزاں پہ ہے مری دسترس، نہ بہار میری بہار ہے

شکوہ فضول وارثی، جب شنوا نہیں کوئی
ہے گزراں یہ زندگی، جیسے بنے گزار دے

دل ہے تو گرم ہوگی پھر محفلِ عشق وارثی
ایک ذرا سی چھیڑ سے کیوں ہے زباں پہ ہائے دل

'فصیح' ہونے کی دعاؤں کا ہی فیض تھا کہ حضرتِ سیماب نے ایسے ایسے کارہائے نمایاں انجام دیے جن پر آج پوری اردو دنیا کو ناز ہے۔

مصروفیات

استاد کی تربیت اور پیر و مرشد کی دعاؤں کا سلسلہ جاری تھا۔ اب حضرتِ سیماب کی شہرت کا بھی آغاز ہو چکا تھا۔ مشاعروں میں شرکت اور تلامذہ کی تعداد میں روز افزوں اضافے نے ان کو مزید مصروف کر دیا تھا۔ مرزا داغ دہلوی کی وفات کے بعد انھوں نے خود اصلاحِ سخن کا سلسلہ تیز کر دیا تھا۔ 1910 کے آس پاس وہ کانپور سے ملازمت ترک کرکے

itsurdu.blogspot.com

آگرہ لوٹ آئے، وجہ یہ تھی کہ وہ بہت زیادہ علیل ہو گئے تھے۔ کچھ دنوں تک آگرہ میں رہنے کے بعد وہ اجمیر شریف چلے گئے وہاں انھوں نے ریلوے آڈٹ آفس میں ملازمت کر لی۔ وہاں وہ پانچ برس تک رہے۔ لیکن سیمابی مزاج صرف ملازمت پر کس طرح اکتفا کرتا۔ انھوں نے اجمیر شریف میں ایک رسالہ 'فانوسِ خیال' جاری کیا۔ یہ رسالہ زیادہ دنوں تک جاری نہیں رہ سکا۔ غالباً وہ 1916 تک اجمیر شریف میں رہے پھر مستعفی ہو کر آگرہ چلے آئے۔

آگرہ میں حضرت سیماب کو کوئی مستقل ذریعۂ معاش نہیں مل سکا تھا۔ البتہ انھیں یہاں آتے ہی فوری طور پر رسالہ 'مرصع' کی ادارت سونپ دی گئی۔ یہ رسالہ منشی فریدالدین خاں گوہر کے مطبع سے شائع ہوتا تھا۔ یہ بہرحال معقول ملازمت نہیں تھی۔ 1917 میں انھیں قلعۂ اکبرآباد میں ملٹری ورکس آفس میں کلرک کی حیثیت سے ملازمت مل گئی لیکن یہ ملازمت بھی انھیں راس نہیں آئی۔

1918 میں وہ کچھ دن ٹونڈلہ (ضلع آگرہ) میں مقیم رہے وہاں سید محمد احسن شہید شمس آبادی ایسٹ انڈیا ریلوے کے ڈی ٹی ایس آفس میں ہیڈ کلرک تھے۔ ان کے حضرت سیماب سے اچھے مراسم تھے۔ شہید صاحب نے انھیں اپنے ہی دفتر میں بحیثیت کلرک ملازمت دلوادی لیکن وہ چونکہ ایک سال سے نواسیر کے مرض میں مبتلا تھے لہٰذا زیادہ دیر تک کرسی پر بیٹھ کر کام نہیں کر پاتے تھے (اس مرض نے تاحیات ان کا پیچھا نہیں چھوڑا) جولائی 1922 میں وہ ڈسٹرکٹ میڈیکل آفیسر کے پاس گئے اور اپنی تکلیف بیان کی لیکن اس نے انھیں زبردستی ڈیوٹی پر بھیج دیا۔ آخر وہ ہیڈ کلرک سے ملے، اس نے انھیں ریلوینگ ٹکٹ کلکٹر کی پوسٹ دے دی لیکن نائٹ ڈیوٹی ملنے کے سبب انھیں اس کام میں بھی پریشانی ہونے لگی۔ انھوں نے راز چاندپوری صاحب کو 27 جولائی 1922 کے مکتوب میں اس ڈیوٹی کا حال بڑے دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے:

> "ارشاد صاحب نے اس وقت پوری ہمدردی کا ثبوت دیا۔ دس بجے، اور انھوں نے اپنے ہاتھ سے کہیں بستر بچھا دیا اور سلا دیا۔ چنانچہ پانچ بجے جگا کر گاڑی میں بیٹھا

> دیا اور میں آگرہ چلا آیا۔ روز یہی ہوتا ہے۔ مگر بھائی یہ تن آسانی کب تک دوسرے پاس (یونی فورم) میں اسٹیشن پر گھومنا پڑے گا۔ اب کی پیر کو روز روشن میں سارا راز کھل جائے گا۔ انفعال پوش راتیں سنیچر تک کی مہمان ہیں میں کہاں اور یہ وبال کہاں۔ بھلا مجھ سے نکٹ کلکٹری ہوگی اور وہ بھی ریلوینگ کی؟..."

ذوقِ ادب نے یہاں بھی انھیں چین سے بیٹھنے نہیں دیا۔ ٹونڈلہ میں وہ ہفت روزہ 'آگرہ اخبار' کی ادارت بھی کرتے رہے شاعری اور مشاعروں کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ محولہ بالا مکتوب میں انھوں نے جن 'ارشاد صاحب' کا ذکر کیا ہے وہ ان کے شاگرد حضرت ارشاد نظامی اکبرآبادی تھے۔ ان ہی کی تحریک پر حضرت سیماب نے یہاں ایک بڑا ادبی کارنامہ انجام دیا۔ اس دور میں حکومتِ ہند نے یا تو باغیانہ مواد کے سبب یا اخلاقِ عامہ پر منفی اثرات کے خدشے کے تحت بہت سی کتابوں کی اشاعت پر پابندی عائد کر دی تھی۔ ان ممنوعہ کتابوں میں تصدق حسین نواب مرزا شوق لکھنوی (متوفی 1871) کی شاہکار مثنوی 'زہرِ عشق' بھی شامل تھی۔ حضرت سیماب نے سکریٹری گورنمنٹ آف انڈیا سے خط و کتابت کر کے مثنوی 'زہرِ عشق' کو کتب ممنوع الاشاعت کی فہرست سے نکلوا کر آگرہ سے شائع کیا، بعد میں محققین اور نقادوں نے اسے شاہکار مثنویوں میں شامل کیا۔ یہاں انھوں نے ایک چھوٹا سا رسالہ 'پری خانہ' بھی مرتب کر کے شائع کیا جس میں ایک مشاعرے میں پڑھی گئی طرحی غزلیں جمع کر دی تھیں۔

1921 میں حضرت سیماب رسالہ 'صوفی' کے مدیر الحاج محمدالدین کی دعوت پر پنڈی بہاؤالدین (پنجاب) گئے اور جلال پور شریف ہوتے ہوئے آگرہ واپس ہوئے۔ انھی دنوں میں ادارۂ رسالہ صوفی نے ان کی دو تالیفات 'سیرۃ الحسین' اور 'سیرت الکبریٰ' شائع کیں۔ اس کے علاوہ دو اور کتابیں 'سوانح نور جہاں بیگم' اور 'حیاتِ داغ' بھی اسی ادارے نے شائع کیں۔ حیرت ہے کہ ان کتابوں کے جو اشتہارات ان دنوں شائع ہوئے تھے ان میں کتابوں کے مؤلف کا نام نہیں دیا گیا۔

ادارۂ صوفی کے لیے انھوں نے کچھ اور کتابیں بھی تحریر فرمائیں ان کے نام کیا تھے وہ شائع بھی ہوئیں یا نہیں ان سب سوالات کا کوئی جواب نہیں ملتا۔

itsurdu.blogspot.com

اب ان کے شاگردوں کا حلقہ وسیع سے وسیع تر ہونے لگا تھا اور ملک کے بیشتر موقر ادبی رسائل اور اخبارات میں شعری و نثری تخلیقات کی اشاعت نے ان کی مقبولیت میں بے پناہ اضافہ کر دیا تھا۔ اسی دوران انھوں نے اپنا اولین دیوانِ غزلیات 'کیمیائے سخن' اپنے شاگرد رشید ساغر نظامی کی مدد سے مرتب کر لیا تھا لیکن یہ دیوان کبھی شائع نہیں ہوا البتہ اس کی کچھ غزلیں 'کلیمِ عجم' میں شامل کی گئیں۔

حضرت سیماب اب ملازمت سے اکتا گئے تھے۔ انھوں نے 9 جنوری 1923 کو حضرت راز چاندپوری کو لکھا:

> ''... بھائی مجھ سے تو یہ بارِ خدمت اٹھ نہیں سکتا، میں بھی بارا، ہمت بھی ہاری، آج ارادہ ہے کل استعفا دے دوں گا۔ جان بچی لاکھوں پائے۔ تندرستی ہے تو پھر کچھ ہو رہے گا۔''

ملازمت ترک کرنے کا ایک واضح سبب خرابیِ صحت تھی لیکن دراصل ان کی آزادانہ فطرت ملازمت کے احکام و تحکم سے بھی اوب گئی تھی۔ دورانِ ملازمت بھی بیرون کا نصف حصہ شعر کہنے یا شعر کی اصلاح میں صرف ہوتا تھا۔ وہ ترکِ ملازمت کے بعد 'وارثی پریس' کے نام سے ایک پرنٹنگ پریس، ایک روزانہ اخبار اور ایک ادبی ماہنامہ شروع کرنا چاہتے تھے لیکن افسوس یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوا۔ 'شعر الحیات' میں تحریر فرماتے ہیں:

> ''آخر معلوم ہوا کہ فطرت نے مجھے اس لیے پیدا نہیں کیا کہ میں اپنی تمام عمر ذہنی غلامی میں بسر کر دوں بلکہ میری تخلیق خدمتِ ادب کے لیے ہوئی ہے۔ اس انکشافِ ضمیری کے بعد میں نے ملازمت کو ابدی استعفا دے دیا اور اکبرآباد (آگرہ) میں مستقل اقامت اختیار کر لی۔''

ملازمت چھوڑنے کا فیصلہ حضرت سیماب کے لیے یقیناً بہت دشوار رہا ہوگا کیوں کہ ان دنوں پورے خاندان کی کفالت کی ذمے داری ان پر ہی تھی۔ بالآخر اوائل 1923 میں ملازمت چھوڑ کر ادبی سرگرمیوں کے لیے کمر کس لی۔

کانگریس کا مشاعرہ

1922 میں کانگریس کا عظیم اجلاس گیا (بہار) میں منعقد ہوا تھا، اس اجلاس کی صدارت تحریکِ آزادی کے اہم رہنما سی آر داس نے کی تھی۔ اس سے قبل کانگریس کے اجلاس منعقدہ احمد آباد میں آل انڈیا قومی مشاعرے کا آغاز کیا گیا تھا۔ گیا کے اجلاس میں بھی مشاعرے کا اہتمام کیا گیا جو 24 دسمبر کی شب ہوا۔ اس مشاعرے کی صدارت حضرت چکبست لکھنوی فرمانے والے تھے لیکن ان کی والدہ علیل تھیں، منتظمین کو کچھ دن قبل یہ بات معلوم ہوئی۔ اتنے قلیل عرصے میں کسی دوسرے اہم اور معتبر شاعر کو صدارت کے لیے راضی کرنا مشکل تھا، ویسے بھی ملک کے حالات اور حکومت کی سختیوں کی وجہ سے شعرا حضرات سیاسی مشاعروں سے کتراتے تھے۔ آزادی کے خواب اور انقلاب کی خواہش کے باوجود بیشتر اساتذۂ سخن خود کو سیاسی محرکات سے دور رکھنے میں عافیت محسوس کرتے تھے، کئی تو خان بہادر، شمس العلما اور ایسے کئی سرکاری خطابات کی تمنا رکھتے تھے۔

مشاعرۂ مذکورہ کے منتظمین نے حضرت سیماب اکبرآبادی کو صدارت کی پیش کش کی اور انھوں نے کسی نفع نقصان کی پروا کیے بغیر صدارت قبول فرمالی جو کہ ملک و قوم کے تئیں ان کے جذبات کی ایک نظیر ہے۔ اسی مشاعرے میں انھوں نے خطبۂ صدارت پڑھنے کو رواج دیا۔ اس وقت ملک بھر میں انگریز حکومت کے خلاف 'تحریکِ عدم تعاون' جاری تھی۔ قومی مشاعرے میں شریک شعرا نے جو غزلیں سنائیں ان میں بھی انقلاب، حب الوطنی اور آزادی کے جذبات موجود تھے۔ حضرت سیماب نے اکیس اشعار کی غزل سنائی جس کے نو شعر 'کلیمِ عجم' میں شامل ہیں۔

اسی سفر کے دوران حضرت حسن امام گیاوی کی تحریک پر 'جمعیت الشعرائے ہند' کی تشکیل کا منصوبہ بنایا گیا حضرت سیماب نے وہیں جمعیت کے اغراض و مقاصد اور قوانین و ضوابط مرتب فرما لیے تھے لیکن یہ محض ایک منصوبہ ہی رہا، عملی طور پر کچھ نہ ہو سکا حالانکہ یہ ایک اچھا اور انوکھا خیال تھا۔

itsurdu.blogspot.com

قصر الادب

حضرت سیماب اکبرآبادی 1923 میں جب آگرہ میں مستقل قیام کی غرض سے آئے تو ان کے سامنے دو اہم امور تھے۔ اولاً یہ کہ پورے خاندان کی کفالت کی ذمے داری ان پر تھی۔ دوسرے یہ کہ ملک بھر میں بحیثیت شاعر ان کی دھوم مچی ہوئی تھی اور اس دوران فیضِ سخن حاصل کرنے کے لیے شاگردوں کا ایک بڑا حلقہ جمع ہوگیا تھا اور خود ان کے ذہن میں بھی کئی تصنیفات اور رسائل کے منصوبے ترتیب پا رہے تھے، چنانچہ حضرت سیماب نے اسی سال ایک علمی اور اشاعتی ادارے 'قصر الادب' کی بنیاد ڈالی۔ قصرالادب کے دفتر میں وہ باقاعدہ تلامذہ کے کلام پر اصلاح فرماتے تھے، خود تخلیقی عمل جاری رکھے ہوئے تھے نیز دیگر ادبا و شعرا کی چھوٹی بڑی کئی کتابیں اس ادارے کے زیر اہتمام شائع ہوئیں۔

ان کے سب سے زیادہ عزیز شاگرد صمد یار خاں ساغر نظامی علی گڑھی بھی ان دنوں انھی کے ساتھ تھے اور وہ نہ صرف ساغر کی ادبی تربیت کے لیے کوشاں تھے بلکہ ان کے مستقبل اور معاش کے لیے بھی فکر مند تھے۔ بڑی غور و فکر کے بعد اگست 1923 میں 'قصر الادب' کے زیر اہتمام ایک ادبی رسالہ ماہنامہ 'پیمانہ' کا اجرا عمل میں آیا۔ حضرت سیماب اس کے سرپرست تھے جب کہ ساغر صاحب کا نام مدیر کی حیثیت سے شائع کیا گیا۔

اس دور میں اردو میں جو رسالے شائع ہوتے تھے ان کے انداز میں اور 'پیمانہ' کے انداز میں بہت فرق تھا۔ یہ رسالہ ہر اعتبار سے بالکل نیا مزاج رکھتا تھا اور حضرت سیماب کے زبردست تخلیقی ذہن نے اس کے نظم و نثر کے انتخاب اور پیش کش کو ایک جدت عطا کر دی تھی لہٰذا پہلے ہی شمارے سے رسالے کی دھوم مچ گئی اور بہت جلد وہ اردو کا اہم ترین ماہنامہ ہوگیا۔ یہاں یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہوگی کہ اس دور میں کچھ رسائل قارئین کو متوجہ کرنے کے لیے معاصر رسائل پر شعرا اور ادبا کی تخلیقات اور کتابوں پر تنقید و تنقیص

کے تیر چلاتے تھے، عموماً ایسے رسائل حدودِ ادب سے بھی گزر جاتے تھے اور طنز، مزاحیہ انداز اختیار کرنے کے بجائے عامیانہ ہو جاتا تھا، بہرکیف ان باتوں سے عام قاری بہت لطف اندوز ہوتے تھے لیکن سنجیدہ ادبی مذاق کے حامل لوگوں کو ان سے تکلیف پہنچتی تھی۔ 'اودھ پنچ' لکھنؤ اور 'بہار' علی گڑھ نے 'پیمانہ' پر تیر چلانا شروع کر دیے لیکن اس کی وجہ سے 'پیمانہ' کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اولین شمارے میں حضرت سیماب نے تحریر فرمایا:

> "میرے قیامِ آگرہ کا عزم مستقل معلوم کرنے کے بعد ساغر صاحب نے ایک رسالہ کے اجرا کی خواہش ظاہر کی اور 'پیمانہ' اسی خواہش کی ایک تصویرِ مخمور ہے۔۔۔"
>
> (20 جولائی 1923)

بہت جلد 'پیمانہ' جدید رجحانات کے حامل اہلِ قلم کا محبوب ترین رسالہ ہوگیا تھا۔ اس دور کو خود حضرت سیماب نے اپنی زندگی کا بہترین دور قرار دیا ہے کیوں کہ ان کی مقبولیت آسمانوں کو چھونے لگی تھی۔ 1925 میں ان کی نظموں کا پہلا مجموعہ 'میستاں' شائع ہوا جس کی تفصیل تصنیفات کے باب میں آئے گی۔

قصرالادب سے حضرت سیماب نے ایک پندرہ روزہ جریدہ 'ثریا' بھی جاری کیا تھا جس کی تفصیل نہیں ملتی ہے غالباً یہ رسالہ زیادہ دنوں تک جاری نہیں رہا۔

انھوں نے اسی دوران ایک اور ادارہ 'دارالتصنیف' بھی قائم کیا تھا۔

بہرکیف 'پیمانہ' جاری رہا۔ اب حضرت سیماب کے شاگردوں کی تعداد اتنی زیادہ ہوگئی تھی کہ انھیں 'دائرۂ سیمابیہ' کے لیے کوئی مستقل منصوبہ بنانے کی فکر لاحق ہوگئی۔ اتنے تلامذہ کی موجودگی کے باوجود وہ اب تک خود اپنی غزلیات کا دیوان شائع نہیں کر پائے تھے۔ ان کی غزلیات کی دھوم سارے ملک میں تھی لیکن انھیں خود اتنی فرصت کہاں تھی کہ یہ کام کر سکیں۔

○

itsurdu.blogspot.com

قیامِ لاہور

1925 کے اواخر میں حضرت سیماب اپنے شاگرد ساغر نظامی کے ساتھ ایک مشاعرے میں شرکت کے لیے جموں گئے۔ وہاں لاہور سے بھی کچھ شعرا مدعو تھے جن میں حضرت تاجور نجیب آبادی بھی شامل تھے۔ ان دنوں لاہور علم و ادب کا ایک بڑا مرکز بن چکا تھا، وہاں ڈاکٹر اقبال، سر عبدالقادر، میاں بشیر احمد، محمد دین تاثر، عبدالمجید سالک پنڈت سدرشن، ظفر علی خاں اور حکیم یوسف حسن وغیرہ جیسے ادبا و شعرا موجود تھے نیز مخزن، ہمایوں اور نیرنگِ خیال جیسے کئی اہم ادبی رسائل بھی لاہور سے شائع ہوتے تھے اور خاصا ادبی ہنگامہ رہتا تھا۔ یہ ادبی ہنگامہ ملک بھر کے سبھی فعال ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں کے لیے باعثِ کشش بھی تھا۔

حضرتِ تاجور نے حضرت سیماب کو لاہور آنے کی دعوت دی، انھوں نے بتایا کہ لاہور میں ان کی سربراہی میں ادارہ 'اردو مرکز' قائم کیا گیا ہے۔ اس ادارے کے تحت اردو شعر و ادب سے انتخاب کر کے شاہکار تحریروں کو کتابی صورت دی جا رہی ہے تاکہ اسے نصابِ تعلیم میں شامل کیا جائے اور طالب علم اس سے فیضیاب ہو سکیں، اس کام کے لیے حضرت اصغر گونڈوی، حضرت جگر مرادآبادی اور حضرت یاس یگانہ چنگیزی کو ذمے داری دی گئی ہے۔ انھوں نے حضرت سیماب کو بھی اس پروجیکٹ میں شامل ہونے کی دعوت دی اور مالی منفعت کا یقین دلایا، اس پروجیکٹ کی اشاعت کا کام عطر چند کپور اینڈ سنز کے ذمے تھا۔ لاہور سے آئے ہوئے دیگر شعرا نے بھی حضرت سیماب کو مشورہ دیا کہ وہ 'قصرالادب' اور 'پیمانہ' کو لاہور منتقل کر دیں۔

اتفاق سے مشہور ادارے فیروز سنز (فیروز پرنٹنگ ورکس لاہور) کے مالک مولوی فیروزالدین بھی جموں تشریف لائے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ کوئی قادرالکلام شاعر جو فارسی اور اردو دونوں زبانوں پر عبور رکھتا ہو، اس سے مولانا رومؒ کی مشہور مثنوی 'مثنوی معنوی' کا منظوم

ترجمہ کروائیں، اس کام کے لیے انھوں نے حیدرآباد میں مقیم حضرت امیر مینائی سے درخواست کی تھی لیکن انھوں نے ضعف اور علالت کے سبب معذرت کر لی تھی۔ جموں میں مولوی فیروز کی نظر انتخاب حضرت سیماب پر آ رکی، انھوں نے حضرت سیماب کو مناسب معاوضے کا وعدہ کیا لیکن یہ شرط بھی لگا دی کہ یہ کام ان کے سامنے یعنی لاہور ہی میں کیا جائے گا۔

لاہور کی ادبی فضا اور ذریعۂ معاش کی کشش نے حضرت سیماب کو یہ فیصلہ کرنے پر مجبور کر دیا کہ وہ آگرہ سے لاہور منتقل ہو جائیں۔ پس اپریل 1926 میں وہ اپنے اہل و عیال اور ساغر نظامی کو لے کر لاہور پہنچ گئے اور اپنے ادبی کاموں میں لگ گئے۔ حضرت سالک نے جس کام کی ذمے داری حضرت سیماب کو سونپی تھی وہ پروجیکٹ ایک ڈیڑھ ماہ میں ختم ہو گیا۔ مثنوی مولانا روم کا ترجمہ بھی انھوں نے چند ماہ ہی میں مکمل کر لیا۔ ادھر لاہور کے موسم اور ادبی فضا دونوں ہی انھیں راس نہ آئے۔ 'پیمانہ' کی اشاعت میں بھی پابندی نہ رہ سکی۔ ان تمام حالات نے معاشی پریشانیوں میں مبتلا کر دیا۔ ساتھ ہی ساتھ وطن کی یاد اور تاج محل کی کشش بھی ستا رہی تھی، اب مسئلہ یہ تھا کہ پورے خاندان کی کفالت لاہور میں رہ کر کس طرح کی جائے۔

بالآخر چند ماہ میں ہی (غالباً ستمبر 1926 میں) وہ لاہور کو خیر باد کہہ کر دوبارہ آگرہ چلے آئے۔ لاہور جانا اور ناکام ہو کر واپس آنا ان کی زندگی کا بہت بڑا المیہ تھا، ان کے مالی حالات خراب ہو گئے لیکن اس سفر میں قدرت نے ان سے ایک بہت بڑا کام لے لیا اور وہ تھا مثنوی مولانا روم کا منظوم ترجمہ 'الہام منظوم'۔

○

itsurdu.blogspot.com

ایک اور موڑ

لاہور سے ناکام لوٹنے کے بعد آگرہ میں نئے سرے سے قصرالادب کا آغاز نیز خاندان کی کفالت اور علالت جیسے مسائل نے انھیں زیادہ پریشان کر دیا تھا۔ 1927 کے اوائل میں سردار دیوان سنگھ مفتوں نے اپنے اخبار 'ریاست' کی ادارت کے لیے حضرت سیماب کو دہلی آنے کی دعوت دی جسے انھوں نے قبول کر لیا، ڈیڑھ سو روپے ماہوار تنخواہ طے پائی۔ ایسے منتشر حالات میں یہ پیش کش ٹھکرائی بھی نہیں جا سکتی تھی۔ ان کی ادارت میں 'ریاست' کے جو شمارے نکلے ان کی دھوم مچ گئی۔ مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ کئی دیگر اخبارات کے مالکان نے انھیں اپنے ہاں کام کرنے کے لیے مدعو کرنے کی کوشش کی لیکن اخباری صحافت ان کے مزاج کے موافق نہ تھی، وہ 'ریاست' کی ادارت سے بھی دستبردار ہونا چاہتے تھے۔ ان کی شاعرانہ طبیعت تو شعر و ادب کی جانب مائل تھی۔ ان کی شاعری پورے شباب پر تھی، شاگردوں کی تعداد بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی۔ مشاعروں کا تانتا لگا ہوا تھا لیکن پابند صحافت سفر کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ بالآخر انھوں نے 'ریاست' چھوڑ دیا۔ اس دوران انھوں نے 'دارالتصنیف' بھی دہلی ہی میں قائم کر لیا تھا۔ حضرت خواجہ حسن نظامی نے انھیں اصلاحی نظمیں لکھنے کا کام دلوا دیا تھا، انھیں روزانہ ایک نظم لکھنے کے بیس روپے ملتے تھے (اعجاز صدیقی، ماہنامہ شاعر نومبر 1965) یہ کوئی مستقل کام نہ تھا۔ جنوری 1928 میں 'پیمانہ' کا ایک شمارہ بھی دہلی سے شائع کیا۔

دہلی کے اس سفر میں حضرت سیماب کو مالی پریشانیاں تو نہیں ہوئیں البتہ ان کی سیمابی طبیعت یہاں بھی مطمئن نہ ہوئی ان کی وہ ساری ادبی سرگرمیاں جو سفر لاہور کی وجہ سے متاثر ہو گئی تھیں پھر ایک بار تیز ہو گئیں، یہ سرگرمیاں اتنی بڑھیں کہ انھیں دہلی سے پھر آگرہ آنے پر مجبور ہونا پڑا۔

مشاغل کی کثرت

جون 1928 کے آس پاس حضرت سیماب مستقل طور پر آگرہ میں آ بسے تھے اور ان کی مصروفیات بھی بہت زیادہ ہو گئی تھیں۔ شاگردوں کی بھیڑ تھی، روزانہ ڈھیروں غزلیں اور نظمیں بغرضِ اصلاح ڈاک سے آتی تھیں۔ اسی دوران 'پیمانہ' دوبارہ جاری ہو گیا تھا لیکن ساغر نظامی اس کے برائے نام مدیر تھے کیوں کہ وہ علی گڑھ جا چکے تھے۔ حضرت سیماب نے 'دارالتصنیف' کے زیر اہتمام کتابوں کی اشاعت کا آغاز بھی کر دیا تھا۔

'دارالتصنیف' کے حوالے سے ایک تکلیف دہ حقیقت کا اظہار بھی ضروری ہے۔ معاشی مسائل کو حل کرنے کے لیے حضرت سیماب نے معقول معاوضے پر دوسروں کے نام سے نثری اور شعری کتابیں تصنیف کیں، اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو دوسروں کے نام منتقل فرمایا اور کئی لوگ ان کی اس عنایت سے ادیب اور شاعر بن گئے۔ یہی نہیں بلکہ صاحب کتاب ہو گئے۔ ضیا فتح آبادی نے 'ذکر سیماب' میں تحریر فرمایا ہے:

> "... سیماب کے کچھ پیشتر شاگرد بھی تھے اور کہا جاتا ہے کہ سیماب کے عہد جوانی کا بیشتر کلام ان کے ایسے شاگردوں کے دواوین میں تلاش کیا جا سکتا ہے چنانچہ بقول کے جو ظلم اور ناانصافی سیماب کے دادا استاد ذوق نے خود پر کی تھی وہ سیماب نے بھی روا رکھی۔ اس غلطی کا نتیجہ ذوق نے بھی بھگتا اور سیماب کو بھی بھگتنا پڑا۔"

لیکن ایسا نہیں تھا کہ وہ صرف دوسروں کے لیے اجرت پر کتابیں لکھتے رہے بلکہ خود ان کی اپنی تصانیف کی تعداد بھی بڑھتی رہی جو اشاعت کی منتظر تھیں۔ وہ پابندی کے ساتھ روزانہ اٹھارہ گھنٹے لکھنے پڑھنے کا کام کرتے اور اردو زبان کی خدمت انجام دیتے رہے۔ مشاعروں کا سلسلہ بھی جاری تھا، نواسیر کے مرض سے ہمیشہ پریشان رہتے تھے۔ ادھر معاصرین سے ادبی بحثیں اور معرکوں کا سلسلہ بھی چل پڑا تھا۔ انھوں نے راز چاند پوری کو

itsurdu.blogspot.com

18 اکتوبر 1931 کے ایک مکتوب میں لکھا:

"... میری موجودہ زندگی جیسی کچھ مصروف گزر رہی ہے اس سے میں خود ہی واقف ہوں۔ اپنے ہاتھوں مصروفیت کے پہاڑ کھڑے کر لیے ہیں اب خود ہی انھیں کاٹ رہا ہوں تاکہ زندگی کی کوئی روشن و پرسکون راہ مل سکے، لیکن جانتا ہوں کہ اس مرحلہ کے طے ہونے تک میں خود باقی نہیں رہ سکتا۔"

'مکتبہ قصر الادب' سے 'پیمانہ' کے بعد جنوری 1929 میں ہفت روزہ اخبار 'تاج' جاری ہوا، یہ اخبار حضرت سیماب کے سیاسی خیالات اور افکار کا ترجمان تھا اور بہت جلد علمی، ادبی اور سیاسی حلقوں میں مقبول ہوگیا تھا۔ غالباً 1930 میں اس اخبار کا ایک شمارہ تمام و کمال منظوم شائع ہوا یعنی ہر خبر ہر تبصرے اور ہر اشتہار کو حضرت سیماب نے شعر کے پیکر میں ڈھال دیا تھا، یہ ان کی بے پناہ قوت شعر گوئی کا ایک زبردست ثبوت تھا اور اس کی اشاعت سے ادبی حلقوں میں تہلکہ مچ گیا تھا۔

فروری 1930 میں رسالہ 'شاعر' کا اجرا ہوا، یہ رسالہ نہ صرف حضرت سیماب کے علمی اور ادبی افکار اور نظریات کا آئینہ تھا بلکہ دبستان سیماب اور اردو ادب اور زبان میں ہونے والے نئے انقلاب کا نقیب بھی۔ 1932 میں 'پیمانہ' بند کر دیا گیا اور 1933 میں 'تاج' کی اشاعت میں بھی تعطل آ گیا لیکن 'شاعر' جاری رہا اور تا حال جاری ہے۔

حضرت سیماب اپنے شاگرد ساغر نظامی کو بہت عزیز رکھتے تھے اور یہ حقیقت ہے کہ ساغر صاحب کی تربیت اور شہرت میں ان کا بڑا دخل تھا، 1934 میں چند وجوہ کی بنا پر استاد اور شاگرد میں شدید اختلافات پیدا ہوگئے۔ ساغر نہ صرف ان سے علاحدہ ہوگئے بلکہ ان کے خلاف پروپیگنڈہ بھی کرنے لگے۔ یہ ایک ایسا حادثہ تھا جس سے حضرت سیماب ٹوٹ سے گئے۔

شراب کی مخالفت

حضرت سیماب شراب نہیں پیتے تھے اور اکثر مشاعروں میں ایسے شعرا سے شدید کراہیت محسوس کرتے تھے جو نشے میں دھت رہتے تھے، شرابی شعرا اکثر مشاعروں میں بدمست ہو کر غیر اخلاقی گفتگو یا حرکات کے مرتکب ہوتے جس سے حضرت سیماب کے

نازک اور صاف ستھرے مزاج کو بہت تکلیف پہنچتی لیکن وہ یہ سب کچھ بے بسی سے دیکھتے رہتے۔ دراصل یہ سب کچھ اردو شاعری کی کہنہ روایت کا حصہ بن گیا تھا۔ فارسی کے زیر اثر شراب اور اس سے متعلق دیگر موضوعات اور لفظیات کو اردو غزل میں بھی لازمی سمجھا جاتا تھا۔ فرسودہ اور غیر مہذب روایات سے بغاوت حضرت سیماب کی اجتہادی شخصیت کا خاصہ تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ 'ام الخبائث' سے اردو شعر و ادب کو نجات ملے۔

وہ اپنی تمام تر مصروفیات کے باوجود اس نازک مسئلے پر ہمیشہ غور کرتے رہتے تھے۔ 1920 میں انڈین نیشنل کانگریس نے شراب نوشی کی لعنت کی مخالفت کا بیڑہ اٹھایا تھا پھر جب 1937 میں ہندوستان کی چند ریاستوں (بہار، بمبئی، مدراس، اڑیسہ اور سی پی وغیرہ) میں کانگریس کی وزارتیں بنیں تو سب سے پہلے مدراس کی کانگریس حکومت نے اپنے صوبے میں شراب بندی کا حکم دیا۔ حضرت سیماب اس اعلان سے بہت خوش ہوئے، انھوں نے رسالہ شاعر کے شمارہ مطبوعہ ستمبر 1937 میں ادارتی نوٹ لکھوایا:

"کانگریسی وزارتیں ہندوستان کے تمام صوبوں میں شراب نوشی کو قانوناً ممنوع کر دینے کی کوشش میں ہیں۔ کیا وقت کی ضرورت متقاضی نہیں ہے کہ اردو شاعری سے بھی اس غلیظ و قدیم موضوع کو نکال دیا جائے۔"

انھوں نے مذکورہ شمارے میں شعرائے ہند کے نام ایک منظوم پیغام دیا:

پرہیز سے تائید معالج کر دو
رسم ترک شراب رائج کر دو
اب ساغر و پیمانہ کو ٹھوکر مارو
اب شاعری سے بھی ان کو خارج کر دو

ان کے اس اعلان سے پوری اردو دنیا میں ایک ہنگامہ سا برپا ہوگیا۔ ان کے ان خیالات کی حمایت اور مخالفت میں ملک بھر کے اخبارات و رسائل میں خوب خوب لکھا گیا کیونکہ روایت کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے شعرا سمجھتے تھے کہ بقول غالب:

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

itsurdu.blogspot.com

چنانچہ مشاعرہ بزمِ ادب بھساول منعقدہ 22 مئی 1938 کے خطبۂ صدارت میں حضرت سیماب نے اعلان کر دیا کہ وہ آئندہ اپنے اشعار میں شراب اور اس کے متعلقہ تمام الفاظ کو استعمال نہیں کریں گے اور دوسرے شعرا سے بھی ایسا ہی کرنے کی خواہش ظاہر کی۔

اکتوبر 1938 میں حضرت سیماب نے رسالہ شاعر میں ایک اعلان شائع فرمایا:

> "آئندہ کسی مشاعرے میں میری شرکت صرف اس یقین پر مشروط ہوگی کہ اس مشاعرے میں کوئی قطعہ، رباعی یا شعر جام و شراب یا متعلقاتِ جام و شراب کے ذکر سے ملوث نہ ہوگا۔"

اس تحریک کی وضاحت میں مدیر رسالہ شاعر اعجاز صدیقی مرحوم نے اگست 1938 کے شمارے میں لکھا:

> "ہندوستان کے ادبی حلقے خوب واقف ہیں کہ حضرت علامہ سیماب اکبرآبادی کئی ماہ سے شعر و شاعری سے موضوع جام و شراب کے اخراج کی کوشش فرما رہے ہیں جس کے اعلانات برابر شاعر میں ہوتے رہے ہیں، چونکہ اس تحریک کا تعلق اخلاقیات سے ہے اس لیے ہندوستان کے گوشے گوشے سے تائید ہو رہی ہے۔ یہ تحریک عالمگیر حیثیت رکھتی ہے اس لیے اس کا مخاطب کوئی ایک شاعر یا ایک ادیب یا کوئی شخص محض نہیں سمجھا جا سکتا۔"

اب عالم یہ تھا کہ اس تحریک کے حامی شعرا بھی پریشان تھے کہ ان موضوعات اور الفاظ کے بغیر آخر کس طرح بات بنے گی۔ یہی حال حضرت سیماب کے شاگردوں کا بھی تھا، وہ سب اپنے استاد کی تحریک کے حامی ضرور تھے لیکن عجیب تذبذب کے شکار تھے اسی لیے پورے شد و مد سے استاد کی تائید نہیں کر پائے۔ ادھر ملک بھر سے ان کی تحریک کے خلاف جو آوازیں اٹھ رہی تھیں ان میں سب سے بلند اور توانا آواز جوش ملیح آبادی کی تھی، وہ دہلی سے ماہنامہ 'کلیم' نکالتے تھے، وہ شراب کے رسیا تو تھے ہی، اس تحریک کے ردعمل سے وہ جام و شراب اور ساغر و مینا کی تشہیر کے لیے مجبور ہو گئے۔ جوش ملیح آبادی نے اس تحریک کو ذاتی رنگ دینے کی کوشش کی اور دونوں کے بیچ معرکہ آرائی اہل ادب کے درمیان کافی عرصے تک دلچسپی کا باعث بنی رہی۔

رسالہ شاعر

یہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ حضرت سیماب نے 'جمعیت الشعرائے ہند' کی تشکیل کا خواب دیکھا تھا، اس کے اغراض و مقاصد اور قوانین و ضوابط بھی مرتب کر لیے تھے لیکن یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکا تھا، 1929 میں انھیں پھر شعرائے ہند کی جماعت بندی کا احساس ہوا، 'تاج' اور 'پیمانہ' جاری تھے۔ لیکن یہ دونوں جرائد (اخبار) نیم ادبی اور سیاسی مزاج کے حامل تھے، انھوں نے شعرا کو متحد کرنے کے لیے ایک خالص ادبی اخبار شائع کرنے کا ارادہ کیا اور 'تاج' اور 'پیمانہ' کے اواخر 1929 کے شماروں میں اس کے اشتہارات بھی شائع کروائے، اس اخبار کے اغراض و مقاصد کچھ یوں تھے:

> "1۔ ایک آل انڈیا لٹریری کانفرنس کا قیام اور اس کے متعلق انتظامی کوششیں، 2۔ ہندوستان کے تمام شعرا کو ایک رشتۂ تنظیم و اخوت میں منسلک کرنا، 3۔ شاعری کو موجودہ مبتذل اور انحطاط پذیر حالات سے ابھارنا، 4۔ موجودہ شاعری کو اس قابل بنانا کہ وہ ترقی ملک و قوم کا باعث ہو، 5۔ شعرا کے حالات و واقعات ہفتہ وار شائع کرنا، 6۔ ایک ایسا ادارۂ اشاعت قائم کرنا جو شعرا کے دیوان اور مجموعۂ کلام کی طباعت اور اشاعت کر سکے، 7۔ شعرا کو گمنامی اور بے قدری کی پستی سے معراجِ شہرت پر لانا اور ہفتہ وار ان کی غزلیں، نظمیں اور کلام شائع کرنا۔"

اولاً اسے ہفت روزہ اخبار کے طور پر شائع کرنے کا منصوبہ تھا لیکن غالب کے یومِ وفات 15 فروری 1930 کو پندرہ روزہ اخبار 'شاعر' کا اولین شمارہ منظر عام پر آیا، اس کے نگراں خود حضرت سیماب اور مدیر ان کے بڑے صاحبزادے منظر صدیقی مرحوم تھے۔ سرورق پر ایک جانب غالب کی تصویر تھی اور دوسری جانب 'جمعیت الشعرائے ہند کا واحد اخبار' تحریر تھا اور ساتھ ہی حضرت سیماب کی نظم کا یہ شعر تھا:

itsurdu.blogspot.com

چنانچہ مشاعرہ بزمِ ادب بھساول منعقدہ 22 مئی 1938 کے خطبۂ صدارت میں حضرت سیماب نے اعلان کر دیا کہ وہ آئندہ اپنے اشعار میں شراب اور اس کے متعلقہ تمام الفاظ کو استعمال نہیں کریں گے اور دوسرے شعرا سے بھی ایسا ہی کرنے کی خواہش ظاہر کی۔

اکتوبر 1938 میں حضرت سیماب نے رسالہ شاعر میں ایک اعلان شائع فرمایا:

> ''آئندہ کسی مشاعرے میں میری شرکت صرف اس یقین پر مشروط ہوگی کہ اس مشاعرے میں کوئی قطعہ، رباعی یا شعر جام و شراب یا متعلقاتِ جام و شراب کے ذکر سے ملوث نہ ہوگا۔''

اس تحریک کی وضاحت میں مدیر رسالہ شاعر اعجاز صدیقی مرحوم نے اگست 1938 کے شمارے میں لکھا:

> ''ہندوستان کے ادبی حلقے خوب واقف ہیں کہ حضرت علامہ سیماب اکبرآبادی کئی ماہ سے شعر و شاعری سے موضوع جام و شراب کے اخراج کی کوشش فرما رہے ہیں جس کے اعلانات برابر شاعر میں ہوتے رہے ہیں، چونکہ اس تحریک کا تعلق اخلاقیات سے ہے اس لیے ہندوستان کے گوشے گوشے سے تائید ہو رہی ہے۔ یہ تحریک عالمگیر حیثیت رکھتی ہے اس لیے اس کا مخاطب کوئی ایک شاعر یا ایک ادیب یا کوئی شخص محض نہیں سمجھا جاسکتا۔''

اب عالم یہ تھا کہ اس تحریک کے حامی شعرا بھی پریشان تھے کہ ان موضوعات اور الفاظ کے بغیر آخر کس طرح بات بنے گی۔ یہی حال حضرت سیماب کے شاگردوں کا بھی تھا، وہ سب اپنے استاد کی تحریک کے حامی ضرور تھے لیکن عجیب تذبذب کے شکار تھے اسی لیے پورے شد و مد سے استاد کی تائید نہیں کر پائے۔ ادھر ملک بھر سے ان کی تحریک کے خلاف جو آوازیں اٹھ رہی تھیں ان میں سب سے بلند اور توانا آواز جوش ملیح آبادی کی تھی، وہ دہلی سے ماہنامہ 'کلیم' نکالتے تھے، وہ شراب کے رسیا تو تھے ہی، اس تحریک کے ردعمل سے وہ جام و شراب اور ساغر و مینا کی تشہیر کے لیے مجبور ہو گئے۔ جوش ملیح آبادی نے اس تحریک کو ذاتی رنگ دینے کی کوشش کی اور دونوں کے بیچ معرکہ آرائی اہل ادب کے درمیان کافی عرصے تک دلچسپی کا باعث بنی رہی۔

رسالہ شاعر

یہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ حضرت سیماب نے 'جمعیت الشعرائے ہند' کی تشکیل کا خواب دیکھا تھا، اس کے اغراض و مقاصد اور قوانین و ضوابط بھی مرتب کر لیے تھے لیکن یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکا تھا، 1929 میں انھیں پھر شعرائے ہند کی جماعت بندی کا احساس ہوا، 'تاج' اور 'پیمانہ' جاری تھے۔ لیکن یہ دونوں جرائد (اخبار) نیم ادبی اور سیاسی مزاج کے حامل تھے، انھوں نے شعرا کو متحد کرنے کے لیے ایک خالص ادبی اخبار شائع کرنے کا ارادہ کیا اور 'تاج' اور 'پیمانہ' کے اواخر 1929 کے شماروں میں اس کے اشتہارات بھی شائع کروائے، اس اخبار کے اغراض و مقاصد کچھ یوں تھے:

> ''1۔ ایک آل انڈیا لٹریری کانفرنس کا قیام اور اس کے متعلق انتظامی کوششیں، 2۔ ہندوستان کے تمام شعرا کو ایک رشتۂ تنظیم و اخوت میں منسلک کرنا، 3۔ شاعری کو موجودہ مبتذل اور انحطاط پذیر حالات سے ابھارنا، 4۔ موجودہ شاعری کو اس قابل بنانا کہ وہ ترقی ملک و قوم کا باعث ہو، 5۔ شعرا کے حالات و واقعات ہفتہ وار شائع کرنا، 6۔ ایک ایسا ادارۂ اشاعت قائم کرنا جو شعرا کے دیوان اور مجموعۂ کلام کی طباعت اور اشاعت کر سکے، 7۔ شعرا کو گمنامی اور بے قدری کی پستی سے معراجِ شہرت پر لانا اور ہفتہ وار ان کی غزلیں، نظمیں اور کلام شائع کرنا۔''

اولاً اسے ہفت روزہ اخبار کے طور پر شائع کرنے کا منصوبہ تھا لیکن غالب کے یوم وفات 15 فروری 1930 کو پندرہ روزہ اخبار 'شاعر' کا اولین شمارہ منظرِ عام پر آیا، اس کے نگراں خود حضرت سیماب اور مدیر ان کے بڑے صاحبزادے منظر صدیقی مرحوم تھے۔ سرورق پر ایک جانب غالب کی تصویر تھی اور دوسری جانب 'جمعیت الشعرائے ہند کا واحد اخبار' تحریر تھا اور ساتھ ہی حضرت سیماب کی نظم کا یہ شعر تھا:

itsurdu.blogspot.com

پیدا ہوا ہے فکر کی مشکل کشائی کے لیے
شاعر ہے آوازِ خدا ساری خدائی کے لیے

مذکورہ شمارے کے اداریتی نوٹ کا ایک اقتباس دیکھیں:

"میں عرصۂ دراز سے ایک ایسے خالص ادبی اخبار کے اجرا کا خواب دیکھ رہا تھا جو صرف جماعتِ شعرا کا منتظمہ آرگن ہو اور جس کے ذریعہ مشرقی فنِ شاعری کو موجودہ انحطاط کی پستیوں سے نکال کر معراجِ ترقی پر پہنچایا جاسکے۔ الحمدللہ کہ آج اس خواب کی تعبیر 'شاعر' کی صورت میں پیشِ نظر ہے۔ ہندوستان میں اردو کے تحفظ و تہذیب کے لیے بے شمار انجمنیں قائم ہو چکی ہیں لیکن شاعری کی تہذیب اور شعرا کی تنظیم کے لیے کوئی عملی قدم اب تک نہیں اٹھایا گیا اور وہ شاعری جو کبھی مایۂ صد ناز تھی، آج صرف سرمایۂ تفریح و تفنیک بن کر رہ گئی ہے... یوں تو کوئی اخبار اور کوئی رسالہ ایسا نہیں جو ہماری جماعت کا مرہونِ قلم نہ ہو، بلکہ مجھے یوں کہنے دیجیے کہ آج ہندوستان کی صحافت ہماری جماعت کی توجہ سے دلچسپ اور قابلِ بنی ہوئی ہے، پھر بھی شعرا کسی اخبار اور کسی رسالہ کو اپنی جماعت کا نمائندہ اور ترجمان نہیں کہہ سکتے۔ اسی ضرورت کے احساس نے اجرائے 'شاعر' پر مجھے آمادہ کیا اور میری آمادگی کا یہ پہلا نقشِ عمل ہے۔"

حضرت سیماب کے اختراعی ذہن اور 'شاعر' کے جدید مزاج نے جلد ہی عاشقانِ شعر و ادب کو اپنی جانب متوجہ کر لیا۔ ادھر خود ان کی اپنی مصروفیات میں روز افزوں اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ 'شاعر' کو پندرہ روزہ نکالنا کسی حد تک دشوار بھی ہو چلا تھا اس لیے اسے ماہنامہ کر دیا گیا اور جون 1932 سے یہ اخبار سے رسالہ ہو گیا۔ 'شاعر' کے مشمولات شروع ہی سے دیگر رسائل کے مقابلے میں قدرے مختلف رہے، اس زمانے میں حضرت سیماب فنِ شاعری کے رموز و نکات تحریر فرماتے تھے اور اصلاحِ سخن کی ایسی باریکیاں طالب علموں کو معلوم ہوتی تھیں جو اساتذۂ سخن تمام عمر نہیں بتا پاتے تھے، 'شاعر' نے 'مناظرے' اور 'مناثرے' کو رواج دے کر ان شعرا میں بھی نثر و نظم لکھنے کا ذوق پیدا کر دیا جو صرف غزل کہتے تھے، رسالے میں املا، انشا، تخیل اور معانی و بیان کی ایسی تشریح و اصلاح ہوتی تھی کہ مشکل سے مشکل فنی رموز بھی طالب علموں کو آسان لگنے لگتے تھے۔ حضرت سیماب نے فرسودہ لفظیات کو متروک قرار دیتے ہوئے نئی تراکیب اور لفظیات کو رواج دیا، مثلاً اردو میں لفظ 'رومان' ان ہی کا رواج

دیا ہوا ہے۔ 'شاعر' کے مستقل اور مقبول کالموں میں 'جرعات' اور 'ہمارا پیام' شامل تھے، 'جرعات' صرف اداریہ ہی نہیں بلکہ ماہ بہ ماہ اردو ادب کی تاریخ اور مسائل و مباحث کی ایک داستان بھی ہے۔ 'ہمارا پیام' میں حالاتِ حاضرہ اور شخصیات پر حضرت سیماب کے قطعات اور رباعیات کا زبردست شہرہ تھا، اس کے علاوہ 'شاعر کی راتیں' ایک دلچسپ ترین سلسلہ تھا جس میں حضرت سیماب ان مشاعروں کے یادگار واقعات قلم بند کرتے تھے جن میں وہ خود شریک ہوئے۔ 'شاعر' میں اساتذۂ سخن اور چند معاصر رسائل کے ساتھ ادبی معرکے قارئین کی دلچسپی کا ایک بڑا سبب رہے۔

فروری 1932 میں مدیر 'شاعر' منظر صدیقی مرحوم اپنی علالت کے سبب دہلی چلے گئے، اب 'شاعر' کی ادارت خود حضرت سیماب کے ذمہ آگئی اور شریک کار کی حیثیت سے ان کے دوسرے فرزند اعجاز صدیقی مرحوم رسالے سے وابستہ ہو گئے بلکہ ستمبر 1935 سے وہ باقاعدہ مدیر شاعر بنا دیے گئے۔ رسالے میں نئے نئے تجربے کیے گئے اور نئے نئے عنوانات قائم کیے گئے مثلاً: آئینے کے سامنے، شاعرانہ معلومات، اصلاحِ سخن، محاکات، معیار، استفسار اور مشورے، سلسلۂ محاوراتِ دہلی، عام فہم عروض وغیرہ۔ اور یہ سب کچھ حضرت سیماب کی کاوشوں کا نتیجہ ہوتا، ایسا لگتا ہے کہ وہ شعر گوئی اور تلامذہ کے کلام پر اصلاح دینے کے علاوہ ہمہ وقت عربی، فارسی، اردو اور دیگر زبانوں کی لغات، قواعد کی کتابوں، اساتذہ کے دواوین اور معاصر کتب و رسائل کے مطالعے کے ساتھ ساتھ مستقل قلم چلاتے رہتے تھے، حیرت ہوتی ہے۔

علامہ اقبال نے رسالہ شاعر کے تعلق سے اپنے خیالات کا اظہار یوں فرمایا ہے:

"رسالہ 'شاعر' اب مبتدیوں کے مذاق سے گزر کر منتہیوں کے مفاد کا باعث ہوتا جاتا ہے۔ خدا اس کی عمر دراز کرے۔ میں چاہتا ہوں کہ ہر صوبہ کے سرعۂ تعلیم میں 'شاعر' منظور کر لیا جائے۔ خود بھی کوشش کر رہا ہوں، آپ بھی توجہ فرمائیں۔"

(شاعر، ص 5۔ جون 1932)

فروری 1951 سے (حضرت سیماب کی وفات کے بعد) 'شاعر' آگرہ سے ممبئی منتقل ہو گیا اور اعجاز صدیقی مرحوم اپنے خون سے اسے سینچتے رہے۔ یہ شجر سایہ دار پھلتا پھولتا رہا۔ 9 فروری 1978 کو ان کا انتقال ہو گیا۔ شاعر جب آگرہ سے ممبئی منتقل ہوا تو اس کے مزاج

itsurdu.blogspot.com

میں بھی نمایاں تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ اس سفر میں انتظامی امور ان کے فرزند ناظر نعمان صدیقی کے سپرد رہے اور تا حال ہیں۔ اعجاز صدیقی کے بعد ان کے بڑے فرزند تاجدار احتشام صدیقی مدیر اعلیٰ ہوئے اور تیسرے فرزند افتخار امام صدیقی معاون مدیر، 4 فروری 1981 کو تاجدار احتشام صدیقی رحلت فرما گئے تب سے تادمِ تحریر افتخار امام صدیقی اس کے مدیر اعلیٰ ہیں اور شاعر پون صدی سے بھی زائد عرصے سے جاری ہے، نزاعی حالات میں نہیں بلکہ پوری آب و تاب کے ساتھ، علامہ اقبال کی دعا ''خدا اس کی عمر دراز کرے'' قبول ہوئی اور آج شاعر اردو کا سب سے قدیم ادبی رسالہ ہے جو 77 برسوں سے پابندی کے ساتھ جاری ہے۔ اس دوران ضخیم خاص نمبروں، خصوصی اشاعتوں اور ادبی صحافت کے نت نئے تجربوں کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ 'شاعر' ایک رسالہ ہی نہیں بلکہ پون صدی پر محیط ایک داستان ہے جو ایک مضمون نہیں بلکہ ایک پوری کتاب کی متقاضی ہے۔ بہرحال حضرت سیماب نے جو خواب دیکھا تھا، ماہنامہ 'شاعر' اس کی روشن تعبیر ہے۔

○

الہام منظوم

پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ حضرت سیماب اپریل 1926 میں لاہور چلے گئے تھے جہاں مولوی فیروز الدین مالک فیروز سنز لاہور کی فرمائش پر انھوں نے مولانا رومؒ کی شاہکار مثنوی کا منظوم ترجمہ شروع کیا۔

مثنوی معنوی مولانا رومی کی ایسی تصنیف ہے جسے سات سو سال سے بھی زیادہ عرصے سے فارسی ادب میں ہی نہیں دنیائے اسلام میں بھی تقدس کا درجہ حاصل ہے، اس عظیم مثنوی کی جلالتِ شان اب تک نہ جانے کتنے دلوں کو معرفت و عشق کے اسرار سے منور کر چکی ہے۔ اس کے کئی تراجم اور شرحیں موجود ہیں لیکن اردو میں اس کا مکمل منظوم ترجمہ کبھی ہوا بھی ہے یا نہیں یہ وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کیونکہ جن منظوم تراجم کے تذکرے دستیاب ہیں ان میں مثنوی کے چھ دفتروں کے مکمل ترجمے کی دلیل کہیں نہیں ملتی۔

مولوی فیروز الدین نے یہ ضرورت محسوس کی کہ اردو میں مثنوی معنوی کا معیاری اور مکمل منظوم ترجمہ کروا کے شائع کیا جائے۔ اس کام کے لیے انھوں نے سب سے پہلے حضرت امیر مینائی سے رابطہ کیا لیکن چونکہ ان کی عمر کافی ہو گئی تھی اور صحت بھی بہتر نہ تھی لہٰذا انھوں نے معذرت کر لی۔ مولوی صاحب نے کئی استادانِ سخن سے بات کی لیکن کسی نے اس مشکل ترین کام کو ہاتھ میں لینے کی ہمت نہ کی کیونکہ اس کام کے لیے صرف شعر گوئی کی مہارت درکار نہیں تھی بلکہ فارسی اور اردو دونوں زبانوں پر عبور بھی ضروری تھا۔ شعر و ادب کے ہر میدان میں بڑے سے بڑے چیلنج کو قبول کرنا حضرت سیماب کے مشکل پسند مزاج کا حصہ تھا، انھوں نے اس کام کو بھی ایک چیلنج سمجھ کر قبول کیا اور صرف تین سال کے قلیل عرصے میں 'الہامِ منظوم' کے نام سے مثنوی کے مکمل چھ دفتروں کا اردو میں منظوم ترجمہ کر کے پوری اردو دنیا کو حیرت زدہ کر دیا۔ 'الہام منظوم' کے چھ دفتر پینتالیس ہزار سے زائد اشعار پر

itsurdu.blogspot.com

مشتمل ہیں اور ان کی قادر الکلامی کی زبردست مثال بھی۔ مثنوی کا پہلا دفتر اکتوبر 1928 میں شائع ہوا لیکن افسوس کہ اس کے سرورق پر مترجم کا نام دینے کے بجائے مرتب کی حیثیت سے مولوی صاحب نے اپنا نام دیا البتہ دیباچے میں حضرت سیماب کا ذکر کیا ہے، اس سے اس دور کے ذی حیثیت ناشرانِ کتب کی ذہنیت کا پتہ چلتا ہے۔ خیر بعد میں بھی دفتر حضرت سیماب کے نام سے ہی شائع ہوئے۔

حضرت سیماب کی خواہش تھی کہ ترجمے میں بھی 'مثنوی' کی اثر آفرینی قائم رہے اس لیے انھوں نے ابتدا میں بارگاہِ خداوندی میں یوں التجا کی:

فی الحقیقت مثنوی کا ترجمہ — ترجمہ ہے وحی اور الہام کا
گر تری توفیق ہو جائے رفیق — طے ہو اک پل میں یہ وادیٔ عمیق

وہ مزید دعا کرتے ہیں کہ:

جو بھی جوہر آئینے کے ہوں عیاں — ان کی طلعت کا بنے یہ ترجماں
مقصد اور مضمون پورا کھول کر — ترجمہ ہو خوش بیانی سے مگر
ہر جگہ مقبول ہو اردو میں بھی — مثنوی مولوی معنوی
کام تھا یہ اک گروہِ خاص کا — اور یہاں ہے آسرا اخلاص کا

دعا کو شرفِ قبولیت حاصل ہوئی اور حضرت سیماب نے بامحاورہ، سلیس اور دل کش زبان میں فارسی زبان کے مفاہیم کو ملحوظ رکھا، اصل خصوصیت کو برقرار رکھا اور اپنی انفرادیت بھی قائم رکھی۔ واضح رہے کہ 'الہامِ منظوم' کے سارے اشعار ایک ہی بحر میں ہیں۔ یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ 'الہامِ منظوم' سے چند مثالیں پیش کی جائیں۔ آغازِ دفتر اول دیکھیں:

بشنو از نے چوں حکایت میکند — سن تو کیا کرتی ہے باتیں بانسری
از جدائی ہا شکایت میکند — بس شکایت کر رہی ہے ہجر کی
کز نیستاں تا مرا ببریدہ اند — جب سے کاٹا ہے نیستاں سے مجھے
از نفیرم مرد و زن نالیدہ اند — مرد و زن روتے ہیں میرے شور سے
سینہ خواہم شرحہ شرحہ از فراق — پارہ پارہ کردے سینہ جب فراق
تا بگویم شرح دردِ اشتیاق — تب کہیں ہو شرحِ دردِ اشتیاق

ہر کسے کو دور ماند از اصلِ خویش — جا رہا ہو اصل سے جو اپنی دور
باز جوید روزگار وصلِ خویش — اپنا عہدِ وصل ڈھونڈے گا ضرور
من بہر جمعیتے نالاں شدم — میں ہر اک مجلس میں فریادی ہوئی
جفت خوش حالانان و بدحالاں شدم — غم زدوں اور خوش دلوں کے منہ لگی
ہر کسے از ظن خود شد یارِ من — سب نے یاری مجھ سے کی حسبِ گماں
وز درونِ من نہ جست اسرارِ من — پر نہ ڈھونڈے مجھ میں اسرارِ نہاں

ترجمہ کرتے وقت حضرت سیماب نے اپنی ذہانت اور عروض و زبان پر قدرت کی وجہ سے اس مشکل پر قابو پانے کی کوشش کی ہے اور لفظی ترجمے میں ایسے الفاظ تلاش کیے ہیں جو فارسی کے مفہوم کو زیادہ سے زیادہ صحت کے ساتھ ادا کر سکیں۔ 'الہامِ منظوم' کی مختلف جلدوں سے متعدد ایسے اشعار پیش کیے جا سکتے ہیں جن سے حضرت سیماب کی پُرگوئی، ان کی قابلیت اور ترجمے کی خوبی واضح ہو جاتی ہے۔

مختصر یہ کہ اتنے بڑے کام کو انجام دینا حضرت سیماب کا ایک ادبی کرشمہ ہے۔ اس عہد کے بیشتر شعرا اور استادانِ فن جب غزل کی زلفِ گرہ گیر میں الجھے ہوئے تھے اس وقت اردو کا یہ مجتہد اور پیغمبرِ علم و ادب ایسے ایسے کارنامے انجام دے رہا تھا جن کا تصور بھی عام شعرا کو چھو کر نہیں گزرتا۔ افسوس کہ ناقدانِ سیماب نے ان کے ادبی کاموں کے وسیع کینوس پر پوری طرح نظر نہیں ڈالی۔

○

itsurdu.blogspot.com

غزلیات

سبھی اہل نظر اس بات سے متفق ہیں کہ حضرت سیماب اکبرآبادی اردو غزل کے اہم اور استاد شاعر ہیں لیکن بات یہیں پر ختم نہیں ہوتی۔ لوگوں نے ان کی غزل گوئی کے محاسن بیان کیے، ان کی غزلوں کو تنقید کے مروجہ اور گھسے پٹے پیمانے پر جانچا اور پرکھا بھی گیا لیکن کسی نے یہ جرأت نہیں کی کہ اس میدان میں حضرت سیماب کے مقام کو متعین کرے۔ اس سے پہلے ان کے عہد کی اردو شاعری اور خصوصاً غزل کے مزاج کا جائزہ لینا ضروری ہے۔

حضرت سیماب کے معاصر شعرا میں ان سے عمر میں کچھ بڑے اور کچھ چھوٹے کئی اہم ترین نام موجود تھے بلکہ جب ان کے عروج کا دور آیا تو بعض بزرگ استاد شعرا اس دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ حضرت داغ اور ان کے معاصر اساتذہ نے متعدد لائق شاگردوں کی صورت میں اپنی یادگاریں چھوڑی تھیں، ان میں بے شمار نام ایسے ہیں جنھیں وقت بھلا چکا ہے۔ پھر بھی حضرت سیماب سے سینئر اور کچھ ساتھ کے اور کچھ ان سے عمر میں چھوٹے شعرا کے ناموں پر نظر ڈالیے، حضرت ڈاکٹر اقبال، حضرت فانی بدایونی، حضرت جمال لکھنوی، حضرت جلال لکھنوی، حضرت ریاض خیرآبادی، حضرت طاہر فرخ آبادی، حضرت جاوید لکھنوی، حضرت مضطر خیرآبادی، حضرت عزیز لکھنوی، حضرت وسیم خیرآبادی، حضرت اکبرالہ آبادی، حضرت نوبت رائے نظر، حضرت تجمل جلال پوری، حضرت چکبست لکھنوی، حضرت حسرت موہانی، حضرت سائل دہلوی، حضرت آغا شاعر دہلوی، حضرت بے خود دہلوی، حضرت عفی لکھنوی، حضرت حکیم آزاد انصاری، حضرت جلیل مانکپوری، حضرت نوح ناروی، حضرت احسن مارہروی، حضرت شفق عماد پوری، حضرت وحشت کلکتوی، حضرت شاد عظیم آبادی، حضرت ظفر علی خاں، حضرت تاجور نجیب آبادی، حضرت آرزو لکھنوی، حضرت دل شاہ جہاں پوری، حضرت درد کاکوروی، حضرت جوش ملیح آبادی، حضرت جگر مرادآبادی، حضرت برجموہن

کیفی، حضرت مانی جائسی، حضرت بزم آفندی، حضرت جوش ملسیانی، حضرت نیاز فتح پوری، حضرت قمر بدایونی، حضرت ماہر القادری، حضرت محمد دین تاثیر، حضرت یاس یگانہ چنگیزی اور بھی بہت سے اہم نام ہیں جو سرِدست مجھے یاد نہیں آرہے ہیں۔ کیسے کیسے لوگ تھے اور کیا کیا کام کیا ہے ان ہستیوں نے، ان سبھی ناموں کے پڑھنے سے تو محسوس ہوتا ہے کہ اردو شاعری اور خصوصاً اردو غزل اس پورے عہد میں بہت توانا اور مالا مال رہی ہوگی لیکن اگر اس عہد کو مختلف ادوار میں تقسیم کر دیا جائے تو صورت کچھ مختلف نظر آئے گی۔

بہت کم عمری ہی میں حضرت سیماب نے شعر گوئی کا آغاز کر دیا تھا۔ یہ وہ دور تھا جب عموماً اردو غزل وقتِ تفریح کا ذریعہ سمجھی جاتی تھی۔ غزل کے اجزائے ترکیبی گل و بلبل شمع و پروانہ، سرو و قمری، شراب و شباب اور شانہ و زلف وغیرہ تھے۔ اردو غزل قدیم فارسی غزل کی روایات و خصوصیات سے باہر نہیں نکل سکی تھی اور ان ہی روایتی موضوعات کو نئے زاویے دے کر، زبان کے کمالات دکھا کر غزل کہنا ہی کمالِ فن سمجھا جاتا تھا، تخیل پر تغزل کو فوقیت تھی اور شاعری تفریح و تعیش بلکہ فحش نگاری کا دوسرا نام تھی یا پھر اس سے کچھ مختلف، مذہب اور تصوف کے موضوعات کو برتا جانے لگا تھا لیکن اس میں بھی عمومیت تھی۔ ایسے ہی ماحول میں حضرت سیماب نے شعر گوئی کی ابتدا کی، ظاہر ہے کہ ابتدا میں انھوں نے بھی غزل کے مروجہ مزاج کو اپنانے کی کوشش کی ہوگی۔ لیکن وہ اپنے طالب علمی کے زمانے سے ہی اس روایتی غزل گوئی سے بے زار تھے، وہ ان شعرا کو پڑھنا پسند کرتے تھے جنھوں نے غزل میں نئی راہیں تلاش کرنے کی کوشش کی، خصوصاً غالب ان کی توجہ کا مرکز رہے۔ اس وقت مشاعروں کی واہ واہ اور عام داد و تحسین شعرا کے لیے بڑی نعمت ہوا کرتی تھی، ایسے ماحول میں اگر ایک طالب علم نئی روش تلاش کرنے کی کوشش کرے اور فرسودہ ماحول و مزاج سے خود کو بچانا چاہے تو وہ اس کی جدتِ پسند طبع ہی کہلائے گی۔ حضرت سیماب نے بھی اپنی جدت پسندی ہی کو اپنا رہنما کیا۔

سولہ سال سے بیس سال کے درمیان انھوں نے ویسی ہی غزلیں کہیں جیسا اس عہد کا ماحول و مزاج تھا، حضرت داغ کی تربیت کا اثر بھی ان پر واضح طور پر ہوا۔ وہ تمام قدیم موضوعات اس دور میں ان کی غزلوں میں موجود تھے جو عام شاعری کا مطمحِ نظر تھے یعنی

itsurdu.blogspot.com

معاملہ بندی، ہجر و وصال، گل و بلبل، شمع و پروانہ اور قفس و آشیانہ وغیرہ متانت اور سلیقہ، صاف زبان، سادہ اور بے تکلف طرزِ تغزل سے حضرت داغ کے اثرات نمایاں ہوتے ہیں۔ لیکن یہ دور بہت طویل نہیں تھا۔ مطالعہ، مشاعروں کی شرکت، ملازمت اور ذمہ داریوں کے احساس نے جلد ہی ان کے شعری رویوں میں تبدیلیاں پیدا کر دیں، اب ان کی غزلوں میں واردات و احساسات، الفاظ کا شکوہ اور بصیرت میں وسعت پیدا ہوگئی۔ زبان و بیان کی حلاوت، محاورات کا صحیح محل، جدید تراکیب اور جذبات کی گہرائی ان کی ریاضت کو ثابت کرتی ہے بلکہ اس شاعری پر بعض جگہ غالب کی تقلید کا گمان ہوتا ہے اور وہ اپنے استاد حضرت داغ کے قدیم رنگِ سخن سے بہت بالاتر معلوم ہوتے ہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ اب ان کا شمار ہندوستان کے اہم استاد شعرا میں ہونے لگا تھا اور سیکڑوں مبتدی شعرا ان کے زیرِ تربیت شعری سفر کی ابتدا کر چکے تھے، اب ان کے مزاج نے اس فرسودہ اور غیر مہذب شعری نظام (غزل اور مشاعرے) میں تبدیلی کی ضرورت کو محسوس کر لیا تھا، اب ایک مجتہد ادب اپنے 'معتقدات' کا تعین کر چکا تھا۔ چونکہ ان کے ابتدائی دور کی غزلیں کافی مشہور تھیں اور بہت سے اشعار ملک کے گوشے گوشے میں گونج رہے تھے اور زبان زدِ خاص و عام تھے۔ لہٰذا انھوں نے 'کیمیائے سخن' کے نام سے ان غزلوں کا ایک دیوان مرتب کر لیا تھا لیکن وہ شائع نہیں ہو سکا۔

خود حضرت سیماب بھی 'کیمیائے سخن' کے دور کی غزلوں سے غالباً پوری طرح مطمئن نہیں تھے۔ لہٰذا نئے دور کی غزلوں کا ایک ضخیم دیوان 'کلیمِ عجم' 1936 میں شائع فرمایا، البتہ 'کلیمِ عجم' میں 'صہبائے کہن' کے ذیلی عنوان کے تحت 'کیمیائے سخن' کا کچھ کلام منتخب کر کے شامل ضرور کیا تاکہ قارئین کو ان کے پرانے شعری رویوں کا اندازہ ہو سکے اور باقی بچا ہوا کلام تلف کر دیا۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اس تلف شدہ کلام کا بیشتر حصہ معمولی رد و بدل کے ساتھ ان کے ایک شاگرد رشید کے اولین مجموعے میں شامل ہے اور ایک دور میں اس بات کو ادبی حلقوں میں کافی اچھالا بھی گیا لیکن اب اس کا تذکرہ بے سود ہے اور میں ان باتوں کو کوئی اہمیت نہیں دیتا کہ یہ ہمارے ادب میں ہمیشہ ہی ہوتا رہا ہے اور ہوتا رہے گا، البتہ ایک بات کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں کہ حضرت سیماب نے 'کلیمِ عجم' کی اشاعت کے بعد باقاعدہ

اعلان فرما دیا تھا کہ ان کا جو کلام اس دیوان میں شامل نہیں ہے اور شاگردوں یا ان کے چاہنے والوں کے پاس محفوظ ہے اسے اب ان کے نام سے منسوب نہ کیا جائے، نہ کہیں شائع کیا جائے اور نہ کوئی گلوکار اسے گائے۔ اس دور میں مغنی اور طوائفوں میں ان کا کلام گانا باعثِ فخر سمجھا جاتا تھا۔

'کلیمِ عجم' کی اشاعت نے اس دور کے ادبی منظر نامے میں تہلکہ مچا دیا تھا۔ یہ وہ دور تھا جب حضرت سیماب کی شہرت پورے عروج پر تھی لیکن ساتھ ہی ساتھ ان کے معاصرین میں بھی کئی اہم اور باکمال شعرا کا بھی شہرہ تھا اور اتنے بڑے بڑے ناموں کے بیچ اپنی انفرادیت منوانا آسان نہیں تھا، مغربی افکار پورے معاشرے پر اثر انداز تھے، شعر و ادب بھلا ان سے کیسے بچ سکتا، سرسید احمد خاں کی تحریک اپنی جڑیں مضبوط کر چکی تھی، ہندوستان کی قدیم روایات سے بیزاری کا کھل کر اظہار ہونے لگا تھا، آزادی کے متوالے بھی اپنی کوششوں کو تیز کر چکے تھے اور ملک ایک عظیم انقلاب کی جانب تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ حضرت سیماب بھی ان فنکاروں میں تھے جو سیاسی سماجی انقلاب کے ساتھ ساتھ ادب میں بھی انقلاب کے حامی تھے۔ بس فرق یہ تھا کہ وہ مالا مال مشرقی روایات کے حامی تھے اور مغربی نظریۂ حیات اور فلسفے کو پوری طرح اپنانے کے مخالف۔ انھیں اندازہ تھا کہ اردو غزل فرسودگی اور لفاظی تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ لہٰذا انھوں نے غزل کے ماحول و مزاج کو تبدیل کرنے کے لیے نئی لفظیات، نئے استعارات، نئی تراکیب اور نئے فکری رویوں کو اشعار میں پرونے کی کوشش کی اور بازاری شاعری سے ہٹ کر شعر مہذب کی نئی راہ نکالی۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ انھوں نے غزل کی قدیم روایات سے یکسر انحراف کیا بلکہ ان روایات کے محاسن کی پاسداری اور حفاظت بھی کی اور ان سب نے مل ملا کر ایک نئے لب و لہجے کا روپ اختیار کر لیا جو 'کلیمِ عجم' کی شکل میں سامنے آیا اور یہی لب و لہجہ حضرت سیماب کو اس عہد کے غزل گو شعرا میں ممتاز مقام عطا کر گیا۔ ان تمام محاسن کا اندازہ آپ ان کی غزلوں کے انتخاب سے لگا سکتے ہیں جنھیں کتاب کے آخری حصے میں پیش کر رہا ہوں۔

'کلیمِ عجم' کے ابتدائی صفحات میں 'میرے شعری معتقدات' کے تحت خود حضرت سیماب کے خیالات دیکھیں:

itsurdu.blogspot.com

"... میں اب شاعری میں بلند خیالات اور بلند انسانی جذبات کی ترجمانی کا حامی ہوں۔ میں شاعری میں فلسفہ، حقائق اور معارف کے نکات پسند کرتا ہوں۔ میں اس شاعری کا منکر ہوں جس کا موضوع صرف عورت یا اس کے متعلقات ہوں، یا جو امرد پرستی کی نفسیات پر مشتمل ہو۔ میری شاعری کا موضوع حسن محض اور عشق محض ہے اور تمام ضمائر کا مرجع وہ ذات ہے جو حاملِ حسن اور مرکزِ محبت ہو۔ جس طرح علم شاعری کے لیے ضروری اور لازمی ہے اسی طرح محبت اور شاعری کو بھی میں لازم ملزوم سمجھتا ہوں اور خیالات میں تصنع یا بناوٹ کا حامی نہیں، میں خیالات کو صداقت اور محبت پر مبنی دیکھنا چاہتا ہوں اور حقیقی وارداتِ قلب کی ترجمانی میرا مسلک بیان ہے۔ گو مجھے تمام اصنافِ سخن پر فطرت نے قدرت دی ہے مگر میں نظم، غزل اور رباعی کو اظہارِ خیال کا بہترین ذریعہ سمجھتا ہوں۔ شعر کی الہامی حیثیت پر میرا ایمان ہے۔ میں شعر میں بلند خیال کے ساتھ بلند الفاظ کا موید ہوں، ایسے الفاظ جن میں غرابت نہ ہو اور جنھیں تعلیم یافتہ اصحاب بہ آسانی سمجھ سکیں۔"

اور 'کلیمِ عجم' اپنی لفظیات اور تراکیب کی ندرت کی وجہ سے اہلِ علم اور سخن فہم حضرات کی توجہ کا مرکز بن گیا، بیشتر اہلِ نظر نے اسے حضرت غالب کے نظریہ شاعری کی توسیع قرار دیا لیکن اس دیوان کے اشعار میں ایہام اور شعوری کتر و بیونت کو دخل کم ہے اور الہامی کیفیات کو زیادہ، رنگِ تصوف بھی حضرت سیماب کو حضرت غالب سے مختلف کرتا ہے۔ اس کے باوجود 'کلیمِ عجم' اور اس کے بعد کی غزلوں نے یہ ثابت ضرور کیا کہ جدید غزل کی تاریخ میں غالب کے بعد سیماب ہی دوسرا بڑا نام ہے۔

'کلیمِ عجم' کو تین ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے: 1۔ نشیدِ نو، 2۔ بادۂ دوشیں، 3۔ صہبائے کہن۔ ان تینوں ابواب میں کل 271 غزلیں ہیں اور آخر میں 'جرعات' اور 'موجِ ناتمام' کے عنوان سے متفرق اشعار شامل کیے گئے ہیں۔ ایک تضمین اور تین 'مثلث' بھی موجود ہیں یعنی تین مصرعوں پر مشتمل اشعار کی غزلیں جو ان کی جدت پسندی کو ظاہر کرتی ہیں۔

1946 میں حضرت سیماب کی غزلوں کا دوسرا دیوان 'سدرۃ المنتہیٰ' شائع ہوا یعنی 'کلیمِ عجم' کے پورے دس برس بعد۔ ان دس برسوں میں بہت کچھ تبدیل ہو چکا تھا، دنیا دوسری جنگِ عظیم جھیل چکی تھی۔ ہندوستان آزادی سے صرف چند قدم پیچھے تھا اور مذہب کی بنیاد پر

دو حصوں میں تقسیم ہونے کے درپے۔ صنعتی انقلاب کے بعد کمیونزم یا مارکسزم تعلیم یافتہ اذہان اور کسی حد تک مزدوروں کو متاثر کر چکا تھا۔ اردو ادب میں بھی دیگر زبانوں کی طرح ترقی پسند نظریات شامل ہو چکے تھے۔ یہ عجیب بات ہے کہ 'کلیمِ عجم' کے فوری بعد یعنی 1936 سے ہی حضرت سیماب کی غزلوں میں سیاسی رنگ ابھر کر سامنے آنے لگا یعنی اس وقت جب نثر و نظم میں تو سیاسی موضوعات پر کھل کر لکھا جاتا تھا لیکن دیگر شعرا کی غزلوں میں کہیں کہیں اشاروں، کنایوں میں سیاسی بات کہہ دی جاتی تھی لیکن حضرت سیماب کی غزلوں میں سیاسی پہلو بہت واضح ہے۔ قفس، صیاد، زنداں، سلاسل، آزادی، انقلاب اور ایسے ہی کئی موضوعات ان کی غزلوں میں نمایاں ہیں۔ مولانا حسرت موہانی عملی سیاست میں شامل تھے، ان کی غزلوں میں سیاسی رنگ آنا ضروری تھا لیکن وہ بھی اس موضوع کو اپنی غزلوں میں کم کم ہی جگہ دے سکے، حضرت اقبال کی غزلوں میں بھی سیاسی رنگ برائے نام ہی ہے لیکن حضرت سیماب نے غزل کو سیاسی رنگ دینے کی بھرپور کوشش کی۔ اب یہ اور بات ہے کہ ناقدینِ ادب نے اس ذیل میں ان کی انفرادیت اور اولیت کو قبول نہیں کیا۔

'سدرۃ المنتہیٰ' کی غزلیں صرف سیاست کے خارزار میں بھٹکتی ہیں، ایسا قطعی نہیں ہے۔ ان میں وہ بھرپور تغزل ہے جو حضرت سیماب کا خاصہ ہے۔ ان غزلوں میں حضرت میر کا سا سوز، حضرت غالب کی سی فکر اور لفظوں کی وجاہت اور حضرت داغ کی سی رنگینی بھی ہے، اور شاید یہی ان کا اپنا مخصوص لہجہ ہے جو کلیمِ عجم، سدرۃ المنتہیٰ اور لوحِ محفوظ تینوں مجموعوں میں نظر آتا ہے۔ دوسرے دیوان تک آتے آتے ان کے یہاں ایک عجیب سی متانت کا احساس ہوتا ہے۔ شاید اس کی ایک وجہ ڈھلتی ہوئی عمر ہو یا پھر معنوی اولاد کی کثرت جو انھیں بزرگی کا احساس دلاتی رہی ہو لیکن اس کے باوجود کہیں بھی 'بوڑھاپن' نہیں جھلکتا، ایک عجیب سی تازگی، بہرحال برقرار رہتی ہے۔ ان کی جدت نئے تجربات، نئی لفظیات اور تراکیب تراشنے کا عمل یہاں بھی بدستور قائم ہے۔

اس دیوان کی پہلی غزل کو 'میرا نصب العین' کا عنوان دیا گیا ہے۔ کل 114 غزلیں اور دو تضمینیں ہیں، ایک غزل بہ اسلوبِ نظم ہے اور 'جرعے' کے تحت متفرق اشعار شامل ہیں۔ ان سب میں حضرت سیماب کے شاعرانہ معتقدات بھی ملحوظ رہے ہیں۔

itsurdu.blogspot.com

ان کے انتقال کے 28 برس بعد یعنی 1979 میں ان کی غزلوں کا تیسرا مجموعہ 'لوحِ محفوظ' شائع ہوا۔ اس مجموعے میں 1943 سے 1951 تک کہی ہوئی غزلیں شامل ہیں جنھیں حضرت اعجاز صدیقی نے بڑی محنت سے یکجا کیا تھا لیکن افسوس کہ ان کی یہ محنت خود ان کی وفات کے ایک برس بعد مطبوعہ شکل میں سامنے آسکی۔ برسبیلِ تذکرہ جانشین سیماب اور عظیم مجاہد اردو حضرت اعجاز اپنی زندگی میں خود اپنی غزلوں کا مجموعہ بھی شائع نہیں کرواسکے۔ یہ ہماری زبان اور اس کے ادب کا ایک المیہ ہے... خیر! 'لوحِ محفوظ' میں ایک سو پانچ غزلیں شامل ہیں جو حضرت سیماب کی قادرالکلامی کی مظہر ہیں۔

'لوحِ محفوظ' کی غزلوں میں پختگی، شائستگی اور سلیقگی کے ساتھ ساتھ زبان اور تراکیب کے تجربات بھی ملتے ہیں۔ ان میں ایک طرف تقسیمِ ہند کا غم جھلکتا ہے تو دوسری طرف ہجرت کا کرب، سیاسی تبدیلیوں پر متعدد اشعار ہیں، لیکن ایک خصوصیت بہت واضح ہے کہ اس مجموعے کی بیشتر غزلیں معرفت کی انتہائی منازل کی جانب شاعر کے سفر کی نشاندہی کرتی ہیں۔ قرآنِ مجید کا منظوم ترجمہ کرنے کے بعد یقیناً وہ 'انکشاف' کی منزلوں سے گزرے ہوں گے جو ان غزلوں میں عیاں ہیں۔ کہیں کہیں بزرگانہ اور مشفقانہ رویے بھی پائے جاتے ہیں، ایک ستر برس کے بزرگ کے کلام میں ان رویوں کا موجود ہونا فطری ہے۔ ان سب کے باوجود ان کا اپنا مخصوص لہجہ، روانی اور تازگی پھر بھی موجود ہے۔ 'لوحِ محفوظ' حضرت سیماب کے کمالِ غزل گوئی کے انتہائی عروج کا ثبوت ہے:

حضرت سیماب کے تینوں مجموعہ ہائے غزلیات یعنی کلیمِ عجم، سدرۃ المنتہیٰ اور لوحِ محفوظ میں بیشتر طویل غزلیں ہیں، چار پانچ مطلعے، دو تین مقطعے اور پھر درمیان میں کئی کئی اشعار، سیماب اور وارثی دونوں تخلص استعمال کیے گئے ہیں۔ انھوں نے تقریباً سبھی مروجہ بحروں میں غزلیں کہیں لیکن کچھ غیر معروف بحروں کا استعمال بھی کیا نیز عروضی تجربات کیے۔ مطروحہ غزلوں کے علاوہ ان کی اپنی زمینوں میں بھی کہاں ان کی نشاندہی ایک تحقیق طلب کام ہے۔ سردست صرف اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ان مجموعوں کا مطالعہ کیجیے، آپ خود اعتراف کریں گے کہ حضرت سیماب صفِ اول کے غزل گو شاعر ہیں۔

○

منظومات

حضرتِ سیماب اکبرآبادی نے ہمیشہ غزل کی بہ نسبت نظم کو ترجیح دی۔ گو کہ انھوں نے بہت بڑی تعداد میں غزلیں کہیں لیکن میرے اندازے کے مطابق ان کی نظموں کے مختلف کاموں کو یکجا کیا جائے تو وہ سب کچھ مجموعی طور پر غزل سے کہیں زیادہ ہوگا۔ ان کی تحریروں اور خطبات میں جگہ جگہ نظم کی حمایت ملتی ہے۔ اس کی وجہ کیا تھی، یہ جاننے کے لیے ڈاکٹر زرینہ ثانی مرحومہ کا ایک اقتباس نقل کرنا چاہتا ہوں جو ان کی کتاب 'سیماب کی نظمیہ شاعری' (مطبوعہ فروری 1978 ناشر سیماب اکادمی ممبئی) سے لیا ہے، لکھتی ہیں:

> "سیماب کو اس بات کا احساس تھا کہ بحیثیت شاعر وہ سماج کے ایک عزیز رکن ہیں اور ایک مضبوط ستون۔ اس لیے اپنی شاعری کو غزل گوئی تک محدود نہ رکھتے ہوئے انھوں نے نظم گوئی کی طرف پیش قدمی کی تاکہ وہ قوم میں بجلی کی سی تیزی بھر سکیں کیونکہ صنفِ غزل اپنی فطری ساخت کے لحاظ سے انقلابی اور رجزیہ لہجے کی متحمل نہیں ہوسکتی تھی۔ غزل میں تو نرمی اور شیرینی، گھلاوٹ اور لطافت کی ضرورت ہوتی ہے اور اس زمانے میں اس قسم کی نرمی اور ملائمت قوم کے لیے افیون کا کام کرتی۔ سیماب جانتے تھے کہ اس وقت قوم کو سلانے کی نہیں بلکہ بیدار کرنے کی ضرورت ہے اور جمود و خمود کے پردہ کو چاک کرنا ہے۔ ان کے نظمیہ پیرایہ اختیار کرنے کی دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ غزل کو اس قسم کے پیغامات کا حامل بنا کر اس کی نزاکت اور لطافت، نفاست اور شیرینی کو بھاری بھرکم الفاظ اور گرج دار لہجے سے مجروح کیا جائے۔ انھوں نے ابتداً اپنے زمانے کے اہم واقعات، سیاسی رجحانات اور سماجی میلانات کو نظم میں پیش کیا اور جنگِ بلقان، جنگِ طرابلس، فلسطین، بغاوتِ افغانستان، جنگِ عظیم کے نقوش وغیرہ جیسے اہم موضوعات پر نظمیں لکھیں... سیماب نے اس کی اہمیت و افادیت کو مدِنظر رکھتے ہوئے اسے اپنے پیغام کا وسیلہ بنایا، اس میں حب الوطنی کے ترانے گائے، سیاسی مسلک کو واضح کیا، معاشرت کی اصلاح کی،

itsurdu.blogspot.com

قوم میں روح ترقی پھونکی، انسان اور انسانیت کی ارفع و اعلیٰ منزلوں کی بشارت دی۔"

لیکن اس اقتباس کو حضرتِ سیماب کی مجموعی نظمیہ شاعری کا رسمی سا تعارف کہا جا سکتا ہے، ان نظموں کی تعداد اور موضوعات کی وسعت کا جائزہ ایک مکمل کتاب کا متقاضی ہے۔ شاید اسی لیے مرحومہ نے ان کی نظمیہ شاعری پر ایک جامع اور مبسوط مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی، یہ مقالہ چونکہ خود جانشینِ سیماب حضرت اعجاز صدیقی مرحوم کی سرپرستی میں لکھا گیا تھا۔ لہٰذا اس کی جامعیت پر کسی قسم کے شک و شبے کی گنجائش باقی نہیں رہتی اور حضرت سیماب کی نظموں پر کچھ لکھنے کے لیے مذکورہ کتاب ہی مستند ذریعہ سمجھی جا سکتی ہے۔

حضرت سیماب کی نظموں کا اولین مجموعہ 'نیستاں' 1925 میں شائع ہوا تھا۔ اس مجموعے میں مختلف موضوعات پر 57 نظمیں شامل ہیں جو اس دور کے اہم ادبی اور مذہبی رسائل میں شائع ہو کر مقبول ہو چکی تھیں۔ ان نظموں میں ان کا ابتدائی رنگ بھی ہے اور پختگی اور کمالِ فن کی مثالیں بھی، تقریباً سبھی نظمیں اسلامی رنگ لیے ہوئے ہیں لیکن اس دور کے سماجی اور سیاسی حالات کی مظہر بھی۔

حجازیات کے تحت یہ نظمیں شامل ہیں: ترانۂ وحدت، مکہ کی ایک صبح، طوافِ کعبہ، رودادِ بیداد، فریاد وغیرہ۔ 'رودادِ بیداد' (سرکارِ طیبہؐ کے حضور میں) 48 بند پر مشتمل ایک طویل مسدس ہے۔ اس میں مسلمانوں کی زوال آمادہ حالت اور رسولِ پاکؐ سے مدد کی التجا کو نہایت دل سوز انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ بظاہر یہ حضرتِ حالی کی 'مدوجزرِ اسلام' اور حضرتِ اقبال کی 'شکوہ' کے زیرِ اثر لکھی ہوئی نظم معلوم ہوتی ہے لیکن پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ بہت مختلف اور زیادہ اثر انگیز ہے۔ 'شکوہ' میں خدا سے نہایت بے باکی سے خطاب کیا گیا ہے لیکن 'رودادِ بیداد' میں سرکارِ رسالت مآبؐ کی بارگاہ میں بہت ہی ادب اور احترام سے التجا کی گئی ہے۔

مسلمانوں کے سیاسی حالات خصوصاً ترکی کے ادبار و مصائب اور اغیار کے تسلط پر یہ نظم بہت مشہور ہوئی۔ بالکل اسی طرح کی ایک اور مسدس 'فریاد' ہے، اس میں 31 بند ہیں اور اس میں رحمۃ اللعلمینؐ سے فریاد کی گئی ہے۔ رودادِ بیداد کا ایک بند پیش ہے۔

یا نبیؐ سچ تو یہ ہے جان سے بیزار ہیں ہم — کوئی یاور ہی نہیں بیکس و لاچار ہیں ہم
ہاں گنہ گار ہیں ہم سخت گنہ گار ہیں ہم — آپ سے اب تو معافی کے طلب گار ہیں ہم

'نیستاں' کی دیگر نظموں میں عرفانِ نفس، جلال و جمال، ہمہ اوست، دھکوڑی کا محویت خانہ، محمود حسن پرستارہ، پیامِ آرزو، ارضِ تاج، بلبلِ اسیر، دوشیزۂ بہار، نسیمِ برشگال اور جوشِ انتقام وغیرہ شامل ہیں۔ ان کے علاوہ جنت کے خطوط کے عنوان سے چھ منظوم خطوط نہایت سبق آموز ہیں اور بہت جذباتی بھی۔ اس مجموعے کی نظموں کے متعلق ڈاکٹر زرینہ ثانی لکھتی ہیں:

"ان کی نظمیں ... ان کے تخیل کی رفعت، ذہن کی رسائی، خیالات کی گہرائی، جذبات کی پنہائی اور احساسات کی گہرائی کی شہادت دیتی ہیں۔ ان کی کائنات دل پر حسنِ لایزال کی جلوہ سامانیاں ضیا باری کرتی ہیں اور وہ اس سے کسبِ فیض کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ اس تصوف اور اسلامی فکر و فلسفہ کے اثرات ہیں جو ایک مسلمان اور مشرقی علوم و فنون سے آگاہ انسان کے لیے ضروری تھے ... آج اردو شاعری میں انسانی محبت کے تجربے اور نفسیاتِ محبت کے بیان کو بعض مخصوص شعرا ہی کی میراث سمجھ لیا گیا ہے لیکن اب سے تقریباً پچاس ساٹھ برس پہلے سیماب نے اپنے دورِ اول ہی میں اس نفسیات کا خوبصورت تجزیہ کیا ہے۔ وہ فطرتِ انسانی کے نباض ہیں ..."

گو کہ حضرتِ سیماب اس اولین نظموں کے مجموعے کی پرنٹنگ کوالیٹی سے مطمئن نہیں تھے لیکن انھیں 'نیستاں' کی اشاعت سے ایک اطمینان تو ضرور ہوا ہوگا کہ موضوعاتی اور فنی جن تجربات سے وہ اپنے اولین شعری دور سے گزر رہے تھے ان تجربات کو عوام تک لانے میں یہ مجموعہ بہت معاون ہوا۔ سچ پوچھیے تو انھوں نے اپنے شعری سفر کے ابتدائی بیس برسوں میں نظموں میں جو تجربات کیے وہ حیرت انگیز ہیں مثلاً آزاد نظم کی ہیئت پر اردو شاعری میں بہت بعد میں تجربے ہوئے لیکن حضرتِ سیماب نے اس کی ابتدا بہت پہلے کر دی تھی۔ 'نیستاں' میں شامل نظم 'عیدِ قرباں' کا ایک حصہ ملاحظہ فرمائیے۔ یہ نظم 1916 کی ہے اور 'نظام المشائخ' دہلی میں شائع ہوئی:

مری یہ حسرتِ زریں ہلالِ عید پوری کر
کہ میں تنگ آ گیا ہوں اپنی امیدوں کے بیجاں سے

itsurdu.blogspot.com

خدا رکھے تجھے روشن
نگاہیں تجھ پہ ہوں قرباں
مرا غم خوار و مونس بن
کہ پورا ہو مرا ارماں
مجھے لنکا کے لے چل ضوفگن کرنوں کے داماں سے

اب تو یہ ہمارے محققین ہی بتا سکیں گے کہ 1916 تک جب کہ پوری اردو شاعری پر روایت کی کائی جمی ہوئی تھی، کیا کسی اور شاعر نے بھی آزاد نظم کہی تھی یا اس کی اولیت کا سہرا بھی حضرت سیماب کے سر جاتا ہے۔

'نیستاں' کی اشاعت کے دس سال بعد ان کی نظموں کا دوسرا مجموعہ 'کارِ امروز' شائع ہوا، اس وقت تک 'قصر الادب' پوری طرح تابندہ ہو چکا تھا اور ایک استاد شاعر کی حیثیت سے ملک بھر میں حضرت سیماب کا طوطی بول رہا تھا، اب وہ ایک مجتہد کی حیثیت سے ہی نہیں بلکہ مجدد اردو کی حیثیت سے بھی ابھر چکے تھے اور جہاں ان کے گرد تلامذہ اور مداحوں کی بھیڑ لگ گئی تھی وہیں ان کے مخالفین اور ناقدین کا بھی ایک بڑا گروہ سرگرم ہو گیا تھا۔ 'کارِ امروز' اچھوتے خیالات، جدت آمیز جذبات اور نادر احساسات سے معمور نظموں کا مجموعہ ہے جن میں مذہب، سیاست، قومیت، معاشرت، انسانیت، وطنیت، انقلاب اور آزادی کو موضوع بنایا گیا ہے، زبان اور ہیئت کے تجربے، نئی تراکیب اور فرسودہ شعری روایات سے انحراف نے روایتی شاعری کو تقدس کا درجہ دینے والوں کو یقیناً بہت تکلیف پہنچائی ہوگی اور ایسے لوگوں کا حضرت سیماب اور کارِ امروز کے خلاف بولنا یا لکھنا عاشقانِ سیماب کے لیے باعثِ تکلیف رہا ہوگا۔ رسالہ 'نگار' میں حضرت نیاز فتح پوری کئی ماہ تک 'کارِ امروز' پر تبصرہ لکھتے رہے جو بعد میں ان کی کتاب 'انتقادیات' میں بھی شامل کیا گیا۔ اس طویل تبصرے کے جواب میں رسالہ 'شاعر' کا 'کارِ امروز نمبر' (1935) شائع ہوا جس میں کتاب کے تعلق سے اہلِ علم اور عمائدین ملک کی رائیں اور مقتدر اردو، انگریزی جرائد کے تبصرے شامل کیے گئے۔

'کارِ امروز' میں 137 نظمیں ہیں لیکن 'ارضِ تاج' کے عنوان سے 13 مکمل نظمیں شامل ہیں جو نمبر شمار میں درج نہیں۔ ابتدا میں دو فارسی رباعیاں ہیں 'جل جلالہٗ اور صلی اللہ علیہ وسلم، دونوں کے چوتھے مصرع کا قافیہ کارِ امروز ہے۔ پھر تیسری فارسی رباعی 'کارِ امروز و دفترِ فردا' ہے۔ پہلی نظم 'نوائے تجدید' ہے اس کا آخری شعر دیکھیں:

از سرِ نو نظمِ عالم مائلِ تجدید ہے — مقطعِ ہستی سے پیدا مطلعِ امید ہے

اسی نظم سے اس مجموعے کی تازہ مزاجی کا اندازہ ہوتا ہے۔ شعلۂ احساس، صبحِ امت، نزولِ انساں اور انسانیت، اپنے عنوان کے مطابق ہی جذباتی اور روح کو جھنجھوڑنے والی نظمیں ہیں۔ ان میں جہاں زمانے کی دھڑکنیں تیز رو ہیں وہیں تصوف کی وسعتیں بھی ہیں اور پھر 'سری کرشن' ایک ایسی نظم ہے جس سے حضرت سیماب کی انسان دوستی اور انسانیت کے پیغام کی وضاحت ہوتی ہے۔ نظم کا آخری بند ملاحظہ کیجیے اور ایک ترکیب 'فلک واز' پر بھی غور فرمایئے:

دلوں میں رنگِ محبت کو استوار کیا — سوادِ ہند کو گیتا سے نغمہ زار کیا
جو راز کوششِ نطق و زباں سے کھل نہ سکا — وہ راز اپنی نگاہوں سے آشکار کیا
نقوش ثبت کیے اپنی رہنمائی کے — زمیں کو فیضِ قدم سے فلک وقار کیا
دیا جو درسِ زمانے کو، بے مثال دیا — کیا جو کام زمانے میں، یادگار کیا
اداسیوں کو نئی زندگی عطا کر دی — ہر ایک ذرے کو دل دے کے بے قرار کیا
جو مشربِ اس کا نہ اس طرح عام ہو جاتا — جہاں سے محو محبت کا نام ہو جاتا

اسی طرح نظم 'گوتم بودھ' کا آخری شعر:

روشنی جس کی نہ ہوگی ماند، وہ مشعل ہے تو — سرزمینِ ہند کا عرفانِ اول ہے تو

ان دونوں نظموں کے علاوہ بھی شخصیات پر کچھ نظمیں شامل ہیں جیسے محمد علی (ابر)، داغ، میر ناصر علی خاں، غالب اور نظیر اکبرآبادی وغیرہ۔ رسولِ پاکؐ پر دو نظمیں رسولِ کائناتؐ اور روحِ اعظمؐ تو واقعی بے مثال ہیں۔

پہلی جنگِ عظیم اور پھر ہندوستان میں تحریکِ آزادی کی شدت سے حضرتِ سیماب

itsurdu.blogspot.com

کے مزاج اور فکر میں جو تبدیلیاں رونما ہوئی تھیں وہ 'کارِ امروز' کی نظموں میں واضح طور پر محسوس کی جاسکتی ہیں۔ ادھر حضرت اقبال کی شاعرانہ عظمت اور ان کی نظموں کی بے پناہ مقبولیت اور چکبست، جوش اور ظفر علی خاں جیسے کئی شعراء کی نظم کی جانب مراجعت نے حضرت سیماب کو "کچھ مختلف" کرنے پر آمادہ کیا ہوگا کہ یہ ان کی اجتہادی فطرت کا تقاضہ بھی تھا۔ لہٰذا ایسا محسوس ہوتا کہ موضوعات کا تنوع، رومانیت اور روحانیت، وطن پرستی، انقلاب کی خواہش، سرمایہ دارانہ ماحول اور مزاج کی مخالفت، مزدوروں اور عام کچلے دبے لوگوں کا کرب، قومی بے حسی، یہ سب کچھ کئی شاہکار نظموں کی تخلیق کا سبب بن گیا۔ اب حضرت سیماب کی وسعت کا اندازہ ہوا۔

طلوعِ سیاست، ایک پیغام، اہلِ عالم کے نام، بساطِ سیاست، انقلابِ روس، اے سرمایہ دارو، مشرق سے مغرب کو، اعلانِ جنگ، دعوتِ انقلاب وغیرہ ایسی ہی نظمیں ہیں جن میں حضرتِ سیماب قومی اور عالمی سیاست کے نباض محسوس ہوتے ہیں اور احساس ہوتا ہے کہ ایک زندہ زبان کا زندہ شاعر اپنی تمام وسعتوں اور بصیرتوں کے ساتھ خود کو عالمگیر کر رہا ہے۔ ایسی نظموں میں انھوں نے نہ تو کسی مغربی فلسفی اور مفکر کے خیالات کو منظوم کیا اور نہ ہی کسی ضدی اور بے شعور جذباتی نوجوان کی طرح لفظوں کی گھن گرج کا سہارا لیا۔ وہ ایک سنجیدہ اور متین عالم و ناصح محسوس ہوتے ہیں جو ٹھہر ٹھہر کر، متناسب لیکن پر اثر لب و لہجے میں اپنی بات کہتا ہے۔ ان نظموں کی زبان حضرتِ سیماب کی غزلوں سے مختلف ہے اس کے باوجود ہر ہر مصرعے سے سیمابیت جھلکتی ہے، یہ ان کا کمال ہے۔ 'کارِ امروز' کی ایک زبردست نظم 'مزدور' پیش کرنا چاہتا ہوں کہ یہ بالکل آج کی نظم معلوم ہوتی ہے:

گرد چہرے پر، پسینے میں جبیں ڈوبی ہوئی
آنسوؤں میں کہنیوں تک آستیں ڈوبی ہوئی
پیٹھ پر نا قابلِ برداشت اک بارِ گراں
ضعف سے لرزی ہوئی سارے بدن کی جھریاں
ہڈیوں میں تیز چلنے سے، چٹخنے کی صدا
درد میں ڈوبی ہوئی مجروح نخنے کی صدا
پاؤں مٹی کی تہوں میں میل سے چپکے ہوئے
ایک بدبو دار میلا چیتھڑا باندھے ہوئے
جارہا ہے جانور کی طرح گھبراتا ہوا
ہانپتا، گرتا، لرزتا، ٹھوکریں کھاتا ہوا

مضمحل و ماندگی سے اور فاقوں سے نڈھال
چار پیسے کی توقع، سارے کنبے کا خیال
اپنے ہم جنسوں کی بے مہری سے مایوس و ملول
صفحۂ ہستی پر اک سطرِ غلط، مدِّ فضول
اپنی خلقت کو گناہوں کی سزا سمجھے ہوئے
آدمی ہونے کو لعنت اور بلا سمجھے ہوئے
زندگی کو ناگوار اک سانحہ جانے ہوئے
بزمِ کبر و ناز میں فرض اپنا پہچانے ہوئے
راستے میں راہ گیروں کی نظر سے بے نیاز
شورشِ ماتم سے، نغموں کے اثر سے بے نیاز
اس کے دل تک زندگی کی روشنی جاتی نہیں
بھول کر بھی اس کے ہونٹوں پر ہنسی آتی نہیں
ایک لمحہ بھی نہیں فکرِ معیشت سے نجات
صبح ہو یا شام، ہے تاریک اس کی کائنات
دیکھ اے قارونِ اعظم، دیکھ اے سرمایہ دار!
نامرادی کا مرقع، بے کسی کا شاہکار
گو ہے تیری ہی طرح انساں، مگر مقہور ہے
دیکھ اے دولت کے اندھے سانپ، یہ مزدور ہے

'بساطِ سیاست' ایک ایسی طویل نظم ہے جس میں کئی شخصیات کے منظوم اسکیچ ایک مکمل داستان کا روپ اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ شخصیات ہیں سکندر، قیصرِ روم، خالدؓ، صلاح الدین ایوبی، نپولین، انور پاشا، مصطفےٰ کمال پاشا، مہاتما تلک، سی آر داس، لینن، سعد زاغلول پاشا، رضا شاہ پہلوی، امان اللہ خاں، ڈی ویلرا، گاندھی، محمد علی، حسرت موہانی، مسٹر محمد علی جناح، سروجنی نائیڈو، مسیح الملک حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری، ابوالکلام آزاد اور جواہر لال نہرو۔

تم کاش وہی ہوتے، سرِ نزشت اور شاعر کی تربت، ان تینوں نظموں میں ہیئت کے تجربے ان کی جدت پسندی کی نظیر ہیں، وہ اپنے عہد کے واحد ایسے شاعر ہیں جنھوں نے ہر شعبہ ادب میں 'کچھ نیا' کرنے کی کوشش کی اور ان تجربات کی وجہ سے لکیر کے فقیر ادب نویسوں کی مخالفت برداشت کی لیکن اب ان کے تجربات کی اہمیت و افادیت کا اندازہ ہوتا ہے اور شاید یہ حضرت سیماب کی بہت بڑی قربانی لیکن کامیابی ہے۔

اس مجموعے میں حب الوطنی اور ملک کے سیاسی اور معاشرتی حالات پر کئی نظمیں ہیں۔ آزادی، منادی، میرا وطن، نوجوانِ ہندوستان سے۔ ہندوستانی ماں کا پیغام وغیرہ ایسی نظمیں ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں اپنے وطن سے کتنی محبت ہے، وہ آزادی کے کس قدر خواہاں ہیں۔ وہ اہلِ وطن اور ملک کے پورے معاشرے کو یکسر بدل دینا چاہتے ہیں۔

itsurdu.blogspot.com

شاعرانہ تخیل اور جذبات و احساسات سے معمور کئی نظمیں معیاری ادب میں شامل کیے جانے کے لائق ہیں۔ دل کی پیاس، نجمن در آ، تیرے ماضی کی یاد، رنگین تیتری، عقل و عشق، صبح صادق، حسن کو دعوتِ سکوں، انتظار چراغ ساحل اور ایسی ہی کئی نظمیں بہت متاثر کن ہیں۔

کتاب کا آخری حصہ 'ارضِ تاج' خود ایک مکمل مجموعۂ نظم ہے۔ دراصل حضرتِ سیماب کو تاج محل سے انتہائی محبت تھی اور وہ اس بات پر فخر کرتے تھے کہ وہ ارضِ تاج یعنی آگرہ میں پیدا ہوئے۔ اس کا اظہار ان کی بیشتر تحریروں میں ملتا ہے۔ اختصار میری مجبوری ہے ورنہ ان نظموں پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ صرف 'تاج (شبِ تاریک میں)' کا آخری بند پیش کر رہا ہوں۔

تاج منہ سے بولتا ہے ساری دنیا ہے خموش — تاج اب تک ہے درخشاں، تاج والا ہے خموش
رات کو آ تاج میں اور نغمۂ اسرار سن — گلستانِ تاج کا گو پتہ پتا ہے خموش
کوئی سن سکتا ہے سب کچھ اور کوئی کچھ نہیں — ذرہ ذرہ نغمہ گر ہے ذرہ ذرا ہے خموش
ساری دنیا سو رہی ہے تاج جلوہ بار ہے — مادیت خواب میں، روحانیت بیدار ہے

حضرت سیماب کی نظموں کا تیسرا مجموعہ 'ساز و آہنگ' 1941 میں شائع ہوا۔ اس میں 149 نظمیں شامل ہیں جنھیں پانچ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ باب اول میں 'نوائے عصر' کے عنوان سے قومیت، سیاست اور وطنیت پر نظمیں ملتی ہیں۔ باب دوم میں 'صلائے تہذیب' کے عنوان کے تحت مذہب، اخلاق اور معاشرت پر اور باب سوم میں 'حدیثِ ادب' کے نام سے شعر و حکمت پر نظمیں ہیں۔ باب چہارم میں 'سرودِ روح' کے عنوان سے حضرت سیماب کے معتقدات پر نظمیں شامل ہیں۔ پانچواں باب 'نغمۂ معصوم' بچوں کے ذہن و اخلاق کی اصلاح کے لیے سلیس اور آسان نظموں پر مشتمل ہے۔

یہ عجیب بات ہے کہ ان کے دوسرے مجموعہ نظم 'کارِ امروز' اور چوتھے مجموعے 'شعرِ انقلاب' پر تو بہت کچھ لکھا گیا لیکن 'ساز و آہنگ' کو کسی حد تک نظر انداز کر دیا گیا، خود ڈاکٹر زرینہ ثانی صاحبہ بھی سرسری جائزہ ہی لے سکیں حالانکہ 'کارِ امروز' کے بعد حضرت سیماب کی نظمیہ شاعری نے ایک نیا اور اہم موڑ لے لیا تھا۔ اس مجموعے کی سبھی نظمیں ان

کے ذہن و فن کے زبردست اور مثبت ارتقا کی مثالیں ہیں۔ یہ اس دور کی نظمیں ہیں جب تحریکِ آزادی اپنے پورے شباب پر تھی لیکن اندرونی انتشار نے ملک بھر میں ایک عجیب بے یقینی کا سا ماحول پیدا کر دیا تھا۔ جب دنیا دوسری جنگِ عظیم کے دہانے پر تھی اور جب صنعتی انقلاب نے دنیا بھر کا اقتصادی نقشہ یکسر بدل دیا تھا۔

پہلے باب کی نظموں میں 'ہندوستان' ایک زبردست نظم ہے جس میں ملک کے حسین ماضی کو یاد کرتے ہوئے حال اور مستقبل پر فکر کے بادل چھائے ہوئے محسوس ہوتے ہیں اس کے علاوہ اذانِ ہمالہ، صبحِ آزادی کا گیت، ایشیا، وطن، ہندوستانی نوجوان، کہ ہم ہندوستانی ہیں، قومی ترانہ، بہ نژادِ نو، صنم کدۂ جمہوریت، دعوتِ انقلاب، نوحہ وطن، سیاسی قیدی، کارزار فلسطین، تشدد اور عدم تشدد، اہل کشمیر کو ایک پیام مجلس اقوام امن و جنگ، قدم بڑھائے چلو وغیرہ حضرت سیماب کی سیاسی بصیرت اور نظریات کے ساتھ ساتھ قادر الکلامی کی مثالیں ہیں اور زیادہ تر نظموں کا لب و لہجہ کسی سالار کا سا ہے اور زبان ہندوستانی رنگ میں رچی بسی ہوئی ہے۔ لیکن یہ نظمیں محض خطابت یا نعرے بازی نہیں ہیں بلکہ بھرپور شاعری کے نمونے ہیں باب کے آخر میں 'تقویمِ اسلامی کے تین دور' کے عنوان سے تین مکمل نظمیں، ماتمِ ماضی، گریہ حال اور تدبیرِ مستقبل شامل ہیں۔

دوسرے باب کی بیشتر نظمیں اپنے موضوعات کے اعتبار سے آج کا آئینہ لگتی ہیں مثلاً فرقہ پرست ایڈیٹر، دیوالی، عید اور بسنت، میری ہولی، شب برات یا آتشیں رات، عید اک عرفانی کی نظر میں، مغربی مزدور کا پیغام مشرقی مزدور کے نام، مسجد اور مندر کے پرستاروں سے وغیرہ۔ اس کے علاوہ حصولِ علم و دعوتِ عمل پر کئی نظمیں ہیں۔ ایک دلچسپ طویل نظم 'قبروں کے غلط کتبے اور روحوں کے اعمال نامے' میں صوفی، مولوی، بادشاہ، تاجر، لیڈر اور طوائف کے اعمال ناموں کو منظوم کیا گیا ہے۔ ان 6 نظموں کی سیریز میں حضرت سیماب کی شگفتہ مزاجی، طنز کی صلاحیت اور خوشگوار پیرایہ اظہار کا پتا چلتا ہے۔

باب سوم کی نظمیں حضرت سیماب کی قادر الکلامی اور شاعرانہ عظمت کی غماز ہیں۔ صبحِ بہار، اندیشہ، تصور، فرشتہ محبت، تاج شاہی محبت کی ٹھوکروں میں، نیلا ناگنی، کمسن راہبہ سے،

itsurdu.blogspot.com

جنت ارضی، موجِ تصور وغیرہ ایسی نظمیں ہیں جن میں رومانیت، جذبہ تخیل، فکر، شوکتِ لفظی، ٹھہراؤ، عمیق مشاہدہ سب کچھ عیاں ہے۔ لیکن میں صرف یہاں ان کی نظم 'خدا کہاں ہے' کا ایک بند پیش کرسکوں گا:

خدا طویل قباؤں کی جنبشوں میں نہیں ہے — خدا سفید جٹاؤں کی بندشوں میں نہیں ہے
خدا تعیش فانی کی خواہشوں میں نہیں ہے — خدا وقار و عجب کی نمائشوں میں نہیں ہے
خدا کی فکر و طلب میں نہ ہو خراب ادھر آ
خدا کہاں ہے؟ تجھے اس کا دوں جواب ادھر آ

وہ نامرادوں کے مجروح آسروں میں ملے گا — گنہگاروں کی خالص ندامتوں میں ملے گا
وفا پرست کے خونریز دامنوں میں ملے گا — غبارِ راہ سے ملفوف گیسوؤں میں ملے گا
وہ خون و خاک میں جلوہ نما ضرور ملے گا
خدا کے ڈھونڈنے والے خدا ضرور ملے گا

مذہبی عقائد، فلسفہ، روح، آدمیت، دنیا، سب کچھ اگر ایک شاعر پر منکشف ہوں تو جو توانا شعری فضا قائم ہوگی وہ 'ساز و آہنگ' کے چوتھے باب کی نظموں سے عیاں ہے۔ پہلی ہی نظم 'فطرتِ الٰہی کا عرفانی دور اور اس کے مخصوص پیامی' میں ابن آزر، ابن عمران، ابن عبد اللہ عنوانات کے تحت تین حصے ہیں اور انبیاء کی آمد کے تین ادوار کا شاعرانہ اظہار ہیں۔ دیگر نظموں میں خدا کا آخری پیغام، معراج النبی ﷺ اور ایک لمحہ فکریہ، اور ان کے علاوہ وہ بانسری کہاں ہے، میرا پیام، میرا خطاب شری کرشن کی قوم سے، گرونانک جیسی نظموں کا تسلسل وحدت پرستی سے ہوتا ہوا ہندوستانی تصوف اور بھگتی کے مدارج میں داخل ہوجاتا ہے۔ یہاں انھوں نے لامذہبیت کی بھی مخالفت کی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ حضرت سیماب اپنی نظموں میں ترقی پسند تو نظر آتے ہیں لیکن کمیونزم اور مارکس ازم سے بہت دور۔ ظاہر ہے بعد کے ترقی پسند نقادوں نے حضرت جوش کو تو قبول کیا لیکن حضرت سیماب کو نہیں۔

آخری باب میں بچوں کی جو نظمیں ہیں وہ حضرت سیماب کی استادانہ صلاحیتوں کی مظہر ہیں۔ بچوں کے لیے لکھنا آسان کام نہیں خصوصاً اس وقت جب کوئی فن کار ادب کے

افق پر چھایا ہوا ہو وہ بھلا پھر ابتدائی مدارج کی جانب کس طرح دیکھ سکے گا؟

'ساز و آہنگ' حضرت سیماب کا ایک اور شاہکار ہے جس کے محاسن کو نظر انداز کردیا گیا، اس مجموعے کی ایک مختصر نظم 'چراغانِ بہار' پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔ یہ دیوالی کے موقع پر کہی گئی فرمائشی نظم ہے۔

ہیں وطن کو آج کل درپیش ایسے مرحلے — جیسے ہیبت آفریں ہوں راستے ظلمات کے
ہے بظاہر روشنی، باطن کی تاریکی نہ پوچھ — گور سے تاریک تر گوشے ہیں محسوسات کے
آج انساں آزما ہے فطرتِ انسانیت — رخ پر اپنے ڈال کر پردے صفات و ذات کے
اتحاد و صلح سے بیزار ہیں اہل وطن — ہر طرف پر شور کچھ طوفان ہیں جزبات کے
ان کی فطرت کو جگا دے اے چراغانِ بہار
پھر چمک انھیں یہ پروانے اندھیری رات کے

حضرت سیماب کی نظموں کا آخری مجموعہ 'شعر انقلاب' دسمبر 1947 میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد چار برس تک وہ روبحیات رہے، ان چار برسوں میں انھوں نے جو نظمیں کہیں ہوں گی ان میں سے کچھ تو مختلف رسائل میں شائع ہوئیں لیکن کچھ غیر مطبوعہ رہ گئیں اور ان سب کو کتابی صورت نہیں دی جاسکی۔ 'شعر انقلاب' میں 68 نظمیں اور ایک سیاسی غزل شامل ہے۔ یہ پورا مجموعہ سیاسی اور انقلابی نظموں پر مشتمل ہے۔ اس دور میں جب اردو کے بیشتر شعرا کے یہاں سیاسی گھن گرج سنائی دے رہی تھی، جب آزادی کے امکانات واضح ہونے لگے تھے لیکن ملک ایک تقسیم عظیم کے دہانے پر تھا، صرف زمینی تقسیم نہیں بلکہ دلوں اور جذبوں کی تقسیم، بلکہ ایک مکمل اور عظیم تہذیب کی تقسیم، ایسے دور میں حضرت سیماب کی ان نظموں میں بھی وہی سب کچھ ہے جس کی ایسے حالات میں ایک شاعر سے توقع کی جاسکتی ہے لیکن انھوں نے ان نظموں میں کہیں بھی شعریت اور اپنی فنی خصوصیات کو نہیں چھوڑا۔

'شعر انقلاب' کی کچھ نظمیں عالمگیر موضوعات پر ہیں مثلاً دنیا کی حیاتِ نو، کارواں کی پکار، ارض تاج سے ایک ضروری پیغام، ایک اختباہ، تم سے کچھ کہنا ہے اے اقوام مشرق، آویزۂ نیلوفری، پھوٹ کا گیت، ارتقا وغیرہ لیکن ان نظموں کی بنیادیں ہندوستان ہی پر احاطہ

itsurdu.blogspot.com

کرتی ہوئی آفاقی ہوجاتی ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ دوسری جنگ عظیم کے اثرات ان کے دل و دماغ پر نقش ہوگئے تھے، انہیں یہ بھی خدشہ تھا کہ کہیں جنگ کی یہ آگ پھیلتے ہوئے ان کے وطن عزیز کو بھی اپنی لپیٹ میں نہ لے لے، اسی لیے وہ دنیا کے احوالِ جنگ کو منظوم کرتے ہوئے ہر جگہ ہندوستان کی قوت و عظمت کو بیان کرنا نہیں بھولتے۔ قومی نظموں کو جس شان سے حضرت سیماب نے برتا ہے اس کی مثال اس پورے عہد میں حضرت چکبست کے علاوہ اور کسی کے یہاں نہیں ملتی۔ وہ ہندوستانی تہذیب و تمدن کو اتنا عزیز رکھتے ہیں کہ عالمی سیاست کو بھی ہندوستانی تناظر ہی میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ انقلاب کے متمنی ہیں لیکن یہاں بھی وہ یہی چاہتے ہیں کہ ہر خوش گوار انقلاب ان کے وطن ہی کی مٹی سے پھوٹے، ان کے یہاں انقلاب علم و عمل، محبت اور بھائی چارگی اور صرف مادی نہیں بلکہ روحانی ترقی کا نام ہے۔ 'شعر انقلاب' میں جس آزادی کا تصور ملتا ہے وہ صرف عسکری قوتوں سے حاصل نہیں ہوسکتی بلکہ اس میں روحانیت کی طاقت کا بھی استعمال ضروری قرار دیا گیا ہے لیکن وہ روحانیت صرف مسجدوں اور مندروں تک محدود نہیں ہے۔ وہ فرسودہ ماحول میں نئی روح پھونکنا چاہتے ہیں اور افسردگی اور یاس کے ماحول کو مٹا دینا چاہتے ہیں۔ ایسی کچھ نظمیں ہیں: اے ہندوستاں اے حجرہ نشینو، نوروزِ مشترک، دعوتِ جشن عید، نمازِ عید اور محاسبہ ضمیر، ابھی قدم نہ روک، منزل قریب تر ہے، مادیت وغیرہ۔

حضرت سیماب نے اس مجموعے کی نظموں میں ایک طرف تو سلیس اور سادہ زبان استعمال کی ہے تو دوسری طرف بعض مقامات پر فارسی کا سہارا بھی لیا ہے اور یہ فطری بھی ہے کیوں کہ نصف صدی سے زیادہ پر پھیلی ہوئی مشق سخن میں کہیں تو استادانہ ذہنیت اپنا کام دکھائے گی لیکن ان نظموں میں بھی عروض اور ہیئت کے تجربوں سے نہیں چوکے بلکہ متعدد تراکیب استعمال کر کے زبان و بیان کے تجربے بھی کیے۔ سیاسی اور جنگی نظموں کی بابت میں نے جو باتیں عرض کیں انھیں مثالوں سے سمجھانا ضروری تھا لیکن۔ خیر یہاں ان کی تین نظموں کے کچھ حصے پیش کر رہا ہوں، بطور دلیل نہیں بلکہ بطور تبرک:

وقت پر فتح و ظفر پانے کا اب بھی وقت ہے — غیرتوں کے جوش میں آنے کا اب بھی وقت ہے

اس تباہی سے گزر جانے کا اب بھی وقت ہے — حوصلوں کو کام میں لانے کا اب بھی وقت ہے

ہے تری ہمت کا شاید آخری یہ امتحاں

جاگ اے ہندوستاں

پٹ نہ جائیں خاک سے اور خون سے گنگ و جمن — آگ ہر جانب نہ برسے باغ بن جائیں نہ بن

خاک ہوجائیں نہ جل کر یہ ترے سرو و سمن — دیکھ الٹ جائے نہ یہ رنگیں بساط انجمن

بے نشاں تجھ کو نہ کردے انقلاب ناگہاں

جاگ اے ہندوستاں

(نظم 'جاگ اے ہندوستاں')

شکارِ انقلابِ عالم ایجاد کیوں ہوگا — خدا نخواستہ میرا وطن برباد کیوں ہوگا

مجسم شاہکار ذہن فطرت ہے وطن میرا — تجلی گاہ رومان و محبت ہے وطن میرا

کہن گہوارۂ آثارِ عظمت ہے وطن میرا

یہ گہوارہ رہینِ پستیِ افتاد کیوں ہوگا — خدانخواستہ میرا وطن برباد کیوں ہوگا

ودیعت فطرتاً جس کو ہوا سودائے آزادی — جو برسوں سے ہے وقفِ حسرتِ لیلائے آزادی

جسے حاصل نہ اب تک ہو سکا طغرائے آزادی

ابھی وہ قید ہست و بود سے آزاد کیوں ہوگا — خدا نخواستہ میرا وطن برباد کیوں ہوگا

(نظم 'امیدیں' حوصلے)

چھپے بیٹھے ہوئے ہو تم قدامت کے نقابوں میں — مسلسل عورتوں کی طرح رہتے ہو حجابوں میں

اٹھو اور وہ ثبوت اس وقت اپنے مرد ہونے کا — کہ تم ہو مجلسِ اہلِ وطن کے بار یابوں میں

تحفظ میں وطن کے ساتھ اربابِ وطن کا دو — وطن ہے مبتلا اس وقت صد گونہ عذابوں میں

سوادِ ہند کے چاروں طرف بارود پھیلی ہے — نہیں معلوم کس دن آگ لگ جائے شتابوں میں

یہ حجرے ہی تمہارے مستقل مدفن نہ ہوجائیں — کہیں تم دب کے رہ جاؤ نہ بوسیدہ کتابوں میں

ہے عہدِ جنگ، ذہنیت بدل کر باہر آجاؤ — جو زندہ ہو تو حجروں سے نکل کر باہر آجاؤ

(نظم 'اے حجرہ نشینو')

itsurdu.blogspot.com

'شعرِ انقلاب' میں صرف اس دور کے سیاسی اور جنگی حالات ہی کا جائزہ منظوم نہیں کیا گیا ہے بلکہ بعض سماجی برائیوں پر اصلاحی نظمیں بھی شامل ہیں مثلاً شاعر اور جنگ، صبحِ بنارس، میں عید کیا مناؤں، آج کی بیٹی اور کل کی ماں سے، اپنی اپنی جگہ، مراحل، تبدیلیاں اور افکارِ پریشاں وغیرہ لیکن اس سلسلے کی سب سے زیادہ متاثر کن نظم 'بوڑھی بھکارن' ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ کارِ امروز، ساز و آہنگ اور شعرِ انقلاب کی ان تمام وقیع نظموں کو موضوعات کے اعتبار سے الگ الگ کر کے ان کا تجزیاتی مطالعہ کیا جائے۔ حضرت سیماب اپنے عہد کے اہم ترین نظم گو شعرا میں سے ایک تھے اور شاید نظم نگاری میں انھوں نے جتنا سرمایہ اپنے پیچھے چھوڑا ہے اتنا کسی اور شاعر کے یہاں نہیں ملتا۔ ان تین مجموعوں کے علاوہ مذہبی اور اسلامی نظمیں، عزائیہ شاعری، نوٹو اشعار کی اصلاحی اور واقعاتی نظمیں، کانگریسی رہنماؤں اور تحریکوں پر نظمیں، شری کرشن جی پر بارہ طویل نظمیں، اور ان سب کے علاوہ قرآن مجید، مثنوی مولانا روم، احادیث نبوی ﷺ، عربی خطبات وغیرہ کے منظوم تراجم، شعرِ منثور کے عنوان سے نثری نظموں کی ابتدائی کوشش۔ اور بھی بہت کچھ۔ الغرض حضرت سیماب کو عشقِ سخن کہنے والے اس سارے کام سے ہی تو متاثر ہوئے ہوں گے۔ آخر میں حضرت سیماب کے جانشین حضرت اعجاز صدیقی مرحوم کے ایک مکتوب کا اقتباس نقل کر رہا ہوں جو انھوں نے حضرت راز چاند پوری کو 9 اکتوبر 1963 کو ممبئی سے لکھا تھا (مطبوعہ 'داستانِ عہدِ گل' مرتبہ راز چاند پوری، مئی 1971 ناشر نسیم بک ڈپو لکھنؤ)

"... میرے علم میں یہ بات ہے کہ مرحوم (حضرت سیماب) نے کئی طویل قصیدے لکھے تھے، جو سودا، ذوق اور غالب کے قصائد سے کسی طرح کم نہیں تھے، لیکن وہ مل نہیں رہے ہیں۔ جن رؤسا کے لیے وہ لکھے گئے تھے وہ مرکھپ گئے ہیں، نقلیں رکھی نہیں گئیں۔ ٹونک، دتیا، مالیر کوٹلہ، بہاول پور اور مانگرول کے توشہ خانوں کے سامان کا اب پتا نہیں۔ اسی طرح ان کے مرثیوں میں سے ایک مرثیہ بھی نہیں ملتا جو ابوالعلائی پریس (آگرہ) نے چھاپے تھے اور وہ کئی کتابیں بھی دستیاب نہیں جو بچوں اور خواتین کے لیے ان سے لکھوا کر عزیزی پریس اور ابوالعلائی نے چھاپی تھیں یہ باتیں تحقیق طلب ہیں۔"

کفر کا فتویٰ

دین و مذہب سے گہرا لگاؤ حضرت سیماب کی ایک اور خصوصیت تھی۔ اسلامیات کا زبردست مطالعہ تھا۔ اوہ خود بھی صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے، انھیں اکثر مذہبی جلسوں میں علمی اور مذہبی تقاریر کے لیے بھی مدعو کیا جاتا تھا۔ ان کے معاصر شعرا اور ادبا، ان کے شاگرد اور دیگر متعلقین بیشتر انھیں 'مولانا' کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ چوں کہ تصوف سے انھیں گہرا لگاؤ تھا اور 'وارثی' بھی تھے لہٰذا سلوک، جذب کشف، وحدت اور ایسے ہی کئی معاملات و متعلقات اُن کے مزاج میں شامل تھے۔ وہ عبد و معبود، فنا و بقا وغیرہ کو تصوف کے رنگ میں ہی دیکھتے تھے اور یہ رویہ ان کی شاعری میں بھی نمایاں ہے۔

جولائی 1941 کے ماہنامہ 'شاعر' میں ان کی ایک نظم شائع ہوئی تھی جس کا عنوان 'موحدِ اعظم' تھا۔ اس نظم کا مرکزی خیال یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے جب حضرت آدمؑ کو تخلیق کیا تو فرشتوں کو حکم دیا کہ اس کے آگے سجدہ کریں۔ ابلیس جسے اپنی اطاعت ایزدی پر بڑا ناز تھا اس نے آدمؑ کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا کہ وہ صرف خدائے واحد کے آگے سجدہ ریز ہوگا اور غیر اللہ کو سجدہ نہیں کرے گا۔ حضرت سیماب نے اس خیال کو پیش کرتے ہوئے نظم میں اس بات پر زور دیا کہ بندوں کو سوائے اللہ کے کسی اور کے آگے سجدہ ریز نہیں ہونا چاہیے لیکن جس تحقیق پر خدائے واحد کو ناز ہے آج وہی غیر اللہ کے آگے سر جھکاتا ہے اور ابلیس کا انسان کو سجدہ کرنے سے انکار قابلِ ستائش و تقلید ہے اور اس طرح وہ سب سے بڑا موحد ہے۔

اسلامی نقطۂ نگاہ سے شیطان (ابلیس) کا کوئی طریق قابلِ تقلید نہیں ہے یہ ایک عام سی بات ہے۔ ایسے میں حضرت سیماب نے جو ایک نیا پہلو نکالنے کی کوشش کی وہ 'دو جمع دو برابر چار' قسم کے ملاؤں کو ہضم نہ ہو سکی حالانکہ یہ ایک شاعرانہ اظہار تھا اور اس کے پسِ پشت خدا کی وحدانیت کا زبردست اظہار بھی تھا لیکن اچھا خاصا ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ دہلی اور لاہور سے

itsurdu.blogspot.com

احتجاج کی آوازیں بلند ہونے لگیں اور مخالفینِ سیماب نے اس کو خوب خوب اچھالا۔ ادھر راندیر (سورت) کے مفتی حضرت مولانا مہدی حسن نے حضرت سیماب کو کافر قرار دے دیا۔ ان کا ایک طویل مضمون بالاقساط اخبار 'مدینہ' میں شائع ہوا جس میں انھوں نے مذہبی نقطہ نگاہ سے نظم پر شدید تنقید کی۔ اسی اخبار میں نظم اور خالق نظم کے خلاف کئی نظمیں بھی شائع ہوئیں۔ ادبی اور مذہبی حلقوں میں ان دنوں صرف 'موحد اعظم' ہی بحث کا موضوع تھی، ادھر علماء کرام میں سے بھی کچھ نے حضرت سیماب کا دفاع کرنے کی کوشش کی۔ مولانا مہدی حسن کے جواب میں حضرت سیماب نے ایک کامیاب نظم 'غیر اللہ کو پہلا سجدہ' لکھی جو 'شاعر' (دسمبر 1941) میں شائع ہوئی اور پھر کفر کا فتویٰ صادر کیے جانے کے جواب میں ایک اور طویل نظم 'کافر گر سے' تحریر فرمائی جو 'شاعر' جنوری 1944 میں چھپی۔ مولانا مہدی حسن کے اعتراضات کے مفصل اور مدلل جوابات مولوی محمد سلیم الدین جالب مظاہری سہرامی نے طویل مضمون میں لکھے جو 'شاعر' ہی میں بالاقساط شائع ہوا اور اس میں نظم کے متعلق کئی مقتدر اور معتبر اصحاب کی آراء بھی شامل تھیں۔

ان واقعات کا ردعمل کتنا شدید تھا اس کا اندازہ ایک حادثے کے تعلق سے پڑھنے کے بعد ہوا۔ 'شاعر' جنوری 1942 میں حضرت مولانا سید انوار حسین سحاد یلوری سیمابی کا ایک خط مع نظم شائع ہوا تھا جس میں نام نہاد علما کو متنبہ کیا گیا تھا کہ وہ کسی مسلمان پر کفر کا فتویٰ عائد کرنے میں احتیاط برتیں۔ نام نہاد ملاؤں نے مولانا سحا کو بھی کافر قرار دے دیا اور جامعہ نظامیہ سے خارج کروادیا، یہی نہیں بلکہ لاٹھیوں کے زور پر انھیں توبہ کرنے کے لیے مجبور کیا گیا اور ان سے بہ جبر ایک تردیدی بیان لکھوا لیا گیا۔ مولانا سحا کے دل پر ان واقعات کا اتنا گہرا اثر ہوا کہ وہ تین چار ماہ میں ہی رحلت فرما گئے۔

○

رباعیات

رباعی ایک ایسی صنف سخن ہے جسے اردو کے بیشتر شعرا نے محض اپنی فنی مہارت اور عروض دانی کے اظہار کی خاطر اپنایا۔ ایک زمانہ وہ بھی تھا جب استاد شاعر اسی وقت مانا جاتا تھا کہ اس نے مروجہ بحروں میں رباعیاں لکھی ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ رباعی میں فطری شاعری اور خیال اور جذبے کی فراوانی کے بجائے لفظوں کی صناعی زیادہ رہی اور اب تو رباعی کہنے کا چلن کم سے کم ہوتا جارہا ہے۔ اردو شاعری کی پوری تاریخ میں چند ہی شعرا ہیں جنھوں نے اس صنف سخن میں نام پیدا کیا۔ اُستادِ فن ہونے کے ناطے حضرت سیماب کے لیے رباعی کہنا لازمی تھا بلکہ جب انھوں نے ہر صنف ادب میں اتنا کچھ لکھا ہے تو بھلا رباعی کیونکر چھوٹتی؟

حضرت سیماب اکبرآبادی نے ہزاروں کی تعداد میں، رباعیاں کہیں۔ اتفاق سے رباعی گو کی حیثیت سے ان پر کبھی کوئی کام نہیں ہوا بلکہ بیشتر جدولی نقادوں نے تو رباعی گو شعرا کی فہرست میں انھیں شامل ہی نہیں کیا جب کہ مذہب، سیاست، سماج، تاریخ، قدرت، نفسیات، جذبات، ہر موضوع پر ان کے یہاں رباعیاں ملتی ہیں جنھیں پڑھنے کے بعد ایسا لگتا ہے کہ رباعی کہنا ان کی استادانہ ضرورت نہیں بلکہ فطرت تھی۔

اس دور کے سبھی مقتدر ادبی رسائل اور اخبارات میں ان کی رباعیات شائع ہو کر مقبول ہوئیں لیکن 'پیمانہ' اور 'شاعر' میں تو ہر ماہ پابندی کے ساتھ وہ رباعیات شائع کرواتے تھے جو سیاسی، ادبی، سماجی اور اصلاحی ہوا کرتی تھیں۔ عموماً ان کا کوئی نہ کوئی پیغام، کوئی اصلاحی بات یا شاعروں اور ادیبوں سے خطاب رباعی کی شکل اختیار کرلیتا۔ حالات حاضرہ پر ان کی رباعیاں اس عہد کی سماجی، سیاسی اور مذہبی تہذیب کی مظہر ہیں۔ ایک رباعی پیش ہے۔

بد بیں کی نگاہ دیکھ لیتا ہوں میں — قلب بدخواہ دیکھ لیتا ہوں میں
پڑتی نہیں اپنے عیب پر میری نظر — اوروں کے گناہ دیکھ لیتا ہوں میں

(شاعر۔ آگرہ اسکول نمبر 1937)

itsurdu.blogspot.com

پتا نہیں کیوں حضرت سیماب نے ان تمام رباعیات کو کتابی شکل نہیں دی۔ البتہ اواخر مئی 1940 سے اواخر دسمبر 1943 کے دوران انھوں نے حالات حاضرہ اور جنگ عظیم کے تناظر میں کہی گئی تین سو سے زائد رباعیوں کا ایک مجموعہ 'عالم آشوب' مرتب کر کے شائع کروایا۔ لیکن اس مختصر سے وقفے (تقریباً ساڑھے تین سال) سے پہلے اور بعد میں انھوں نے جو رباعیاں کہیں ان سب کا جمع کیا جانا ایک بڑا کام ہے۔

'عالم آشوب' چھوٹے (پاکٹ) سائز کی 430 صفحات پر مشتمل کتاب ہے۔ ناشر مکتبہ قصر الادب دفتر شاعر آگرہ ہے جب کہ سرورق کی پشت پر تحریر ہے۔

"قومی محاذ جنگ صوبہ متحدہ (لکھنؤ) سے شائع کیا۔ باہتمام سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ اینڈ اسٹیشنری ممالک متحدہ (ہندوستان) الہ آباد۔ چھپا۔ 1944"

کتاب کے تیسرے صفحے پر 'انتساب' ہے جو حضرت سیماب نے 31 دسمبر 1943 کو تحریر فرمایا اور کتاب کو یوپی نیشنل وار فرنٹ کے پروانشیل آرگنائزر جناب محمد وہاج الدین صاحب عباسی (آئی سی ایس) کے نام معنون کیا۔ پیش لفظ حضرت مخمور اکبرآبادی نے لکھا ہے۔ اس مجموعے میں اس دور کے عالمی سیاسی منظرنامے، ہندوستان کے سیاسی اور سماجی حالات اور دوسری جنگِ عظیم کے تعلق سے رباعیاں ہیں لیکن ان کی ادبی حیثیت بھی ہے۔ حضرت سیماب کے معاصرین رباعیوں کے موضوعات کو فلسفے، سماج پر طنز اور پند و نصائح تک محدود رکھتے تھے۔ حضرت سیماب کی اختراعی طبیعت نے رباعی کو ایک نئی جہت عطا کی۔ انھوں نے رباعی میں فلسفے کے بجائے حالات حاضرہ اور سیاست کو موضوع بنایا۔ دوسری جنگ عظیم کے اثرات سے قطع نظر اس مجموعے میں بہت سی رباعیاں ایسی بھی ہیں جو آج بھی موضوع اور ٹریٹمینٹ کے اعتبار سے تازہ محسوس ہوتی ہیں۔ تنگیِ داماں کے سبب یہاں چند رباعیاں ہی نقل کر سکوں گا:

جب دست ہوا غبار برساتا ہے
مٹتا نہیں آفتاب چھپ جاتا ہے
ہوتا ہے نقاب گرد آخر خود چاک
خورشید بدستور نکل آتا ہے

تہذیب و سکوں کا ہو وہ منظر پیدا
انسان دل انساں میں کرے گھر پیدا

کردو انسانیت کو اس درجہ بلند
پھر ہو نہ سکے جہاں میں بنظر پیدا
صحرا، نہ سمندر، نہ جبل جائیں گے
دنیا سے یہ سب کہاں نکل جائیں گے
ترمیم یہ ہوگی صفحہ ہستی میں
بدلے ہوئے کچھ نقش بدل جائیں گے

جس نے یہ بسایا ہے جہاں وہ جانے
ہوگا کہ نہیں امن و اماں وہ جانے
ہم کون زمین و آسماں کے ضامن
جس کے ہیں زمین و آسماں وہ جانے

وہ حوصلۂ عرض و دعا ہی نہ رہا
کس سے کہیئے کہ آسرا ہی نہ رہا
برہم ہے خدائی اور فطرت خاموش
جیسے کوئی دنیا کا خدا ہی نہ رہا

معموروں کو ویران کیے جاتے ہیں
تخریب کے سامان کیے جاتے ہیں
اوروں کے زیاں کی دھن میں افراد وطن
خود اپنا ہی نقصان کیے جاتے ہیں

○

itsurdu.blogspot.com

وحی منظوم

حضرت سیماب اکبرآبادی کی بے پناہ تخلیقی صلاحیتیں ان کے ادبی کاموں سے ظاہر ہوتی ہیں۔ شاعری ان کے مزاج کا حصہ تھی بلکہ جس تیزی سے وہ شعر کہتے تھے اس سے الہام کا گمان ہوتا ہے۔ ان کی زباندانی کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں، مثنوی مولانا رومؒ کے منظوم ترجمے سے یہ ثابت ہوگیا کہ فارسی زبان پر انھیں عبور حاصل تھا۔ احادیث نبوی ﷺ اور خطبات عزیزیہ کے منظوم تراجم کر کے انھوں نے عربی زبان کی مہارت بھی ثابت کردی تھی لیکن شاید فن کار ابھی مطمئن نہیں ہوا تھا یا پھر اتنے سارے کام خدا نے ان سے کسی مخصوص ریاضت کی خاطر لیے تھے۔ یہ شدید ریاضت کس کام کے لیے تھی یہ خود حضرت سیماب پر اوائل 1944 میں منکشف ہوا۔

ان کے چھوٹے فرزند مظہر حسین صدیقی نے 'لوح محفوظ' (کراچی ایڈیشن) اور 'وحی منظوم' (طبع اول) میں جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت سیماب پر ان دنوں ایک عجیب سا سکوت طاری تھا اور وہ اکثر کسی گہری سوچ میں غرق رہتے تھے اور بعض اوقات ایک نامعلوم وجدانی کیفیت ان پر طاری ہوجاتی تھی۔ ایک شب کھانے پر جب سبھی افراد خانہ موجود تھے۔ انھوں نے ایک نوید سنائی۔ مظہر مرحوم نے 'وحی منظوم' میں حضرت سیماب کے الفاظ یوں نقل کیے ہیں:

> ''میں ایک عرصہ سے قرآن کریم کا منظوم ترجمہ کرنے کے متعلق سوچتا رہا ہوں۔ مسلسل غور و فکر کے بعد اب یہ محسوس کر رہا ہوں کہ میرے ارادے میں تائید ایزدی شامل ہے۔ ہفتہ عشرہ میں ابتدائی تیاریاں ہوجائیں تو میں کام شروع کردوں گا۔ جب تک ترجمہ مکمل نہ ہوجائے میں کسی بیرونی مشاعرے میں شرکت نہیں کروں گا، البتہ قصرالادب کی وہ ذمہ داریاں جو مجھ سے وابستہ ہیں، بدستور انجام دیتا رہوں گا۔''

یقیناً خدا نے اس عظیم کام کے لیے حضرت سیماب کو منتخب کیا تھا۔ عربی اور دنیا کی دیگر زبانوں میں قرآن مجید کے لاتعداد نثری ترجمے شائع ہوئے۔ بہت سی تفاسیر شائع ہوئیں اور ان کے مترجمین اور مفسرین نے اپنے علم کی انتہاؤں کو بروئے کار لاتے ہوئے یہ عظیم خدمات انجام دیں۔ پھر بھی کلام اللہ کی گہرائیوں اور حکمتوں پر لکھا جاتا رہے گا۔ قرآن کریم کے منظوم تراجم فارسی اور دیگر زبانوں میں بھی یقیناً کیے گئے ہوں گے۔ اردو زبان جب تشکیل کے ابتدائی مراحل میں تھی اس وقت سے کلام الٰہی کو منظوم کرنے کی کوششیں جاری ہیں لیکن 1944 تک جتنے بھی منظوم تراجم ہوئے ان میں سے بیشتر یا تو نامکمل رہ گئے (یعنی پورے تیس پاروں کا منظوم ترجمہ نہیں ہوسکا) یا پھر شعری ضرورتوں کے سبب وہ تشریح و تفسیر کی صورت اختیار کر گئے۔ اس ضمن میں حضرت مولانا عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی کا ایک نہایت معلوماتی مضمون 'وحی منظوم کا ادبی و لسانی مرتبہ' ماہنامہ شاعر بمبئی کی اشاعت مئی 1976 میں شائع ہوا ہے۔

'وحی منظوم' کی فنی، لسانی اور ادبی اہمیت کے متعلق کچھ لکھنے سے قبل میں آپ سے اس اہتمام اور احترام کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جسے ابتدا اور دوران ترجمہ حضرت سیماب نے ملحوظ رکھا۔ اپنے اہل خانہ کو اپنے فیصلے سے باخبر کرنے اور ان سب کی تائید و حمایت حاصل کرنے کے بعد انھوں نے دوسرے روز سے ہی منصوبہ بندی شروع کردی، اس کام کے لیے انھوں نے گھر کی مردانہ نشست گاہ کا انتخاب کیا۔ اردو، عربی اور فارسی کی کئی لغات اور قرآن مجید کے کئی تراجم اور تفاسیر کو قصرالادب کے دفتر سے گھر پر منتقل کردیا گیا۔ چھ سو سادہ صفحات کی جلد سازی کروائی گئی۔ کئی مقامی علمائے دین، مفسرین اور ترجمے کے ماہر افراد سے مشورے کیے گئے، ہر طرح سے مطمئن ہوکر حضرت سیماب نے اپنے معمولات میں ترمیم کی یعنی صبح ناشتہ اور دیگر ضروریات سے فارغ ہوکر وہ نشست گاہ میں تشریف لے جاتے، دروازوں کی چٹخنیں گرادی جاتیں، عود عنبر سلگا دیا جاتا اور وہ باوضو ہوکر منظوم ترجمہ کرنے بیٹھ جاتے، گھر والوں کو ہدایت کردی گئی تھی کہ اگر بہت ہی ضروری کوئی بات ہو تو ٹھیک ورنہ قطعی مخل نہ ہوں۔ دو ڈھائی گھنٹے تک وہ مسلسل کام کرتے۔ نماز کے پابند تو پہلے ہی سے

itsurdu.blogspot.com

تھے، جب کام سے فارغ ہوجاتے تو جائے نماز بچھا کر بارگاہ الٰہی میں سجدہ ریز ہوجاتے۔ نشست گاہ سے باہر آتے ہوئے گھر والوں نے اکثر ان کی آنکھوں کو نم دیکھا۔ مظہر مرحوم کے مطابق کل سات ماہ اور نو دن میں یہ عظیم ترجمہ مکمل ہوگیا (میں نے ترجمے کی تکمیل کی مدت کہیں نو ماہ پڑھی تھی، یاد نہیں کہاں) اتنے قلیل عرصے میں اتنا بڑا اور مشکل ترین کام پورا کرلینا تائید خداوندی اور حضرت سیماب کی قادرالکلامی کی دلیل ہے۔ انھوں نے اس ترجمے کا نام 'وحی منظوم' رکھا۔ یہ بتا دینا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ 'وحی منظوم' کے مکمل ہونے کی اطلاع جب قصرالادب سے شائع ہونے والے رسائل اور اخبارات میں چھپی تو علمی ادبی حلقوں میں تہلکہ مچ گیا۔ ملک کے گوشے گوشے سے مبارک باد کے تار اور خطوط آنے لگے۔ کئی شعرا نے قطعات تاریخ لکھ بھیجے۔ آگرہ والے تو اس کارنامے پر پھولے نہیں سمارہے تھے۔ عمائدین شہر اور کئی اداروں نے مل کر ایک شاندار تقریب کا اہتمام کیا جس میں سرکاری حکام، مشاہیر علمائے کرام، ادبا اور شعرا نیز تلامذہ سیماب اور دیگر اکابرین نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔ اس پروقار تقریب میں حضرت سیماب کی علمی و ادبی خدمات اور 'وحی منظوم' کی تکمیل پر خراج تحسین پیش کیا گیا اور سپاسنامے میں انھیں 'شاعراسلام' کا خطاب دیا گیا۔ کئی پبلشروں نے اس منظوم ترجمے کو شائع کرنے کی پیش کش بھی کی۔

حضرت سیماب ترجمے کے تعلق سے بہت محتاط تھے اور چوں کہ معاملہ کلام اللہ کا تھا لہٰذا انھوں نے کئی مستند علمائے کرام اور ماہرین قرآن کو دکھایا اور ان شخصیات نے ترجمے میں جہاں کہیں ذرا سی بھی عدم مطابقت یا قرآنی مفہوم کے واضح نہ ہونے کا معمولی سا احتمال بھی ظاہر کیا حضرت سیماب نے ان کے مشورے کے مطابق اس سہو یا سقم کی اصلاح کرلی۔ وہ خود ایک ایک لفظ پر غور کرتے رہے اور محتاط رہے کہ کہیں معمولی سی لغزش بھی نہ ہو اور آخر احتیاط اور اصلاح کی ان منازل کو طے کرنے میں انھیں تین سال لگ گئے۔

اب میں 'وحی منظوم' کی خوبیوں پر نظر ڈالوں گا۔ مولانا پرواز اصلاحی لکھتے ہیں:

"... اس خوبی، خوشحالی، شگفتگی، متانت، سلاست، فصاحت و بلاغت کے ساتھ وحی الٰہی اور الہام ربانی کو نظم کے قالب میں ڈھالا ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ صحت

زبان کے ساتھ صحت مفہوم کو مرقوم کرنے کی کوشش پہلی بار اردو زبان میں سیماب صاحب نے کی۔ اس کی اہمیت ادبی لحاظ سے تو ہے ہی، مذہب اور تبلیغی نقطہ نظر سے بھی بہت زیادہ ہے کیوں کہ بہت سے لوگ اس منظوم ترجمہ کو پڑھیں گے تو اسے بہت جلد یاد کرلیں گے۔

اردو کے تمام منظوم تراجم میں ادبی محاسن کے لحاظ سے جس قدر یہ ترجمہ اہم ہے اتنا کوئی نہیں کیوں کہ اس میں جس قدر لغوی معنی کی رعایت کی گئی ہے اتنی کسی منظوم ترجمے میں نہیں ملتی۔ اس کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ عربی الفاظ کے لیے اردو کے ایسے برمحل الفاظ کا انتخاب کیا گیا ہے کہ ان سے بہتر ملنا دشوار ہے۔ ترجمہ باوجود ایک خاصا تحت اللفظ ہے مگر الفاظ سے قطعاً پاک ہے۔ قرآن کی مراد کو واضح کرنے کے لیے جابجا قوسین میں اپنی جانب سے الفاظ بڑھائے گئے ہیں، مگر بہت قلیل مقدار میں۔ حالانکہ نظم تو نظم، نثر میں بھی مترجمین بالعموم یہی طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ بہت سے مترجم ترجمے کو بامحاورہ کرنے کے لیے آخری الفاظ کا ترجمہ شروع میں اور پہلے حصہ کا ترجمہ آخر میں کرتے ہیں لیکن سیماب صاحب کے ترجمہ کی بڑی خوبی یہ ہے کہ ہر لفظ کا ترجمہ اس کے بالکل متقابل میں دیا گیا ہے، اور پھر بامحاورہ اور عام فہم کرنے کی انتہائی کوشش کی گئی ہے۔ اس ترجمہ کو پڑھتے تو اس میں مقدس نغمگی بھی ملتی ہے اور پاکیزہ آہنگ بھی ملتا ہے جو نہ صرف شریفانہ جذبات کو حرکت میں لاتا ہے بلکہ وجد آفریں کیفیت بھی پیدا کرتا ہے۔"

حضرت سیماب نے 'وحی منظوم' میں جہاں ترجمے کے اصولوں کو ملحوظ رکھا وہیں شاعری کے رموز و نکات پر بھی توجہ دی، اس احتیاط اور ذمہ داری کے ساتھ کہ نہ کہیں قرآنی متن کے تقاضے چھوٹیں اور نہ ہی شعریت کم ہو، شاید اسی لیے ترجمہ پڑھتے وقت اکثر ایسی روانی ہوتی ہے، ایسا آہنگ ہوتا ہے کہ قاری اس کی نغمگی میں محو ہوجائے، کمال یہ ہے کہ پورے تیس پاروں کا ترجمہ ایک ہی بحر میں ہے۔

مولانا عبدالرحمن پرواز اصلاحی نے اپنے مذکورہ مضمون میں اور ڈاکٹر زرینہ ثانی مرحومہ نے اپنی کتاب 'سیماب کی نظمیہ شاعری' کے باب 'سیماب کے منظوم ترجمے' میں 'وحی منظوم' اور چند دیگر شعرا کے منظوم تراجم کا تقابلی مطالعہ کیا ہے لیکن میں یہاں اسے ضروری نہ سمجھتے ہوئے حضرت سیماب کے ترجمے کے نمونے پیش کرنا چاہتا ہوں، ملاحظہ فرمائیں:

itsurdu.blogspot.com

نام سے اللہ کے کرتا ہوں آغاز (بیاں)
جو بڑا ہی رحم والا ہے نہایت مہرباں

ہیں سزاوارِ خدائے (پاک) ساری خوبیاں (جو ہے) رب سارے جہانوں کا، رحیم و مہرباں
ہے وہی انصاف کے دن کا بھی مالک (بے گماں)

(یاالٰہی) ہم فقط کرتے ہیں تیری بندگی اور ہوتے ہیں تجھی سے طالب امداد بھی
(یا الٰہی) ہم کو سیدھے راستے پر تو چلا ان کا رستہ جن پر ایمان و کرم تیرا ہوا
راستہ ان کا نہیں جن پر غضب (کی) ہے نگاہ اور نہ ان کا راستہ جو ہوگئے گم کردۂ راہ

(سورۂ فاتحہ)

آسان اور عام فہم زبان میں ترجمہ منظوم کرنے کی ضرورت کے پیش نظر زائد الفاظ کو قوسین میں دیا گیا ہے، عموماً نثری ترجموں میں بھی یہ طریقہ اختیار کیا جاتا ہے وحی منظوم میں کم سے کم قوسین ہیں لیکن کہیں کہیں ضرورتاً ایک پورا مصرعہ بھی قوسین میں درج کرنا پڑا جو کہ بقدر ضرورت ہی ہے مثلاً:

نام سے اللہ کے کرتا ہوں آغاز (بیاں)
جو بڑا ہی رحم والا ہے نہایت مہرباں

(اے پیمبر) ہم قسم کھاتے ہیں تم سے عصر کی بالیقیں انساں خسارے میں ہے (سوچو تو سہی)
ہاں مگر، جو لائے ایماں اور عمل اچھے کیے اور وصیت (دین) حق کی باہمی کرتے رہے
اور جو کرتے رہے تاکید باہم صبر کی (وہ خسارے میں نہیں ہیں، فائدے میں ہیں وہی)

(سورۂ عصر)

ہر سورہ کے ترجمے سے قبل اس میں آیات اور رکوع کی تعداد درج ہے نیز مکی اور مدنی سورتوں کی نشان دہی کے ساتھ بہت معلوماتی حواشی آسان نثر میں لکھے گئے ہیں۔ آخر میں دعائے ختم قرآن بھی منظوم کی گئی ہے۔ 'وحی منظوم' کے تیسویں پارے کو الگ سے مکتبہ پرچم کراچی نے شائع کیا تھا (تفصیل تصنیفات کی فہرست میں دیکھیں) اس مطبوعہ نسخے کے آخر میں اس دور کے مستند علما و فضلا کی آرا بھی شائع کی گئیں تھیں جن میں حضرت مولانا حسین

احمد مدنی، حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، حضرت خواجہ حسن نظامی دہلوی، حضرت مولانا سعید احمد اکبرآبادی، حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، حضرت مولانا محمد میاں، حضرت مولانا عبدالنعیم صدیقی وغیرہ شامل ہیں۔ جب مکمل 'وحی منظوم' سیماب اکاڈمی پاکستان نے شائع کی تو اس میں بھی ان میں سے بیشتر کی آرا کو جگہ دی گئی۔

1981 میں ساری دنیا میں پندرہویں صدی ہجری کے آغاز کی تقریبات ہوئیں، اس موقع پر پاکستان کے اس وقت کے صدر مملکت اور فوجی سربراہ جنرل ضیاء الحق مرحوم نے ہجری صدی تقریبات کمیٹی کی سفارشات پر 'وحی منظوم' کو ہجری ایوارڈ دیا۔ یہ عظیم کارنامہ حضرت سیماب کے ادبی مرتبے اور عظمت کے ساتھ ساتھ آخرت میں ان کی بخشش کا ذریعہ بھی ہے۔

○

itsurdu.blogspot.com

عزائی شاعری

حضرت سیماب کے دل و دماغ پر سانحہ کربلا کے واقعات کا گہرا اثر تھا، زمانہ طالب علمی سے ہی وہ ماہ محرم کے احترام و اہتمام میں پوری عقیدت سے شامل ہوتے تھے، شاعری کے ابتدائی دنوں میں آگرہ میں اپنے گھر سے قریب عزہ خانے میں یکم محرم سے یوم عاشورہ تک بلا ناغہ جاتے اور اپنے اشعار کے ذریعے شہدائے کربلا کو خراج عقیدت پیش کرتے۔ قصرالادب کے قیام کے بعد جب ان کے علم و فن کا شہرہ ملک کے گوشے گوشے میں ہو چکا تھا ان دنوں بھی اپنی زبردست مصروفیات کے باوجود ان دنوں کو اسی عقیدت سے گزارتے۔ اس دوران واقعہ کربلا پر انھوں نے کئی نوحے اور سلام کہے، متعدد نظمیں، رباعیاں اور قطعات لکھے، صرف اردو میں ہی نہیں بلکہ فارسی میں بھی:

راہ ست حسینؓ و خضر راہ ست حسینؓ
بر مسلک توحید گواہ ست حسینؓ
تن گفت حسینؓ متن الا اللہ ست
سر گفت کہ سر لا الہ ست حسینؓ

اگر اس بات کو مان لیا جائے کہ ناموں کا اثر انسانی زندگی پر پڑتا ہے تو مثال حضرت سیماب کی دی جاسکتی ہے۔ والدین نے ان کا نام عاشق حسین رکھا اور شہید اعظم حضرت امام حسینؓ سے عشق ان کی شخصیت کا حصہ بن گیا۔ وہ سنی العقیدہ تھے، اہل بیت سے ان کی عقیدت و محبت بے انتہا تھی، وہ ہر سال محرم میں عزائی نظمیں اور نئے سلام لکھا کرتے تھے، محرم کی سات، آٹھ اور نو تاریخ کو ان کے گھر میں شہدائے کربلا کی فاتحہ خوانی ہوا کرتی تھی، یوم عاشورہ میں امام عالی مقامؓ کی فاتحہ خوانی تو بڑے شاندار پیمانے پر کرتے تھے، آگرہ کے محلہ گلاب خانہ کی مجلس میں بھی وہ شریک ہوتے تھے۔ ان کے نام سے آگرہ میں 'سیماب

لٹریری سوسائٹی' قائم تھی جس کے ذریعہ ہر سال بڑے پیمانے پر 'یوم حسینؓ' منایا جاتا تھا، حضرت سیماب خود اس میں شرکت فرماتے۔

حضرت سیماب نے 1916 تک متعدد طویل مرثیے لکھے جو 'ابوالعلائی اسٹیم پریس آگرہ' نے شائع کیے تھے، انھوں نے ان مرثیوں کی نقلیں نہیں رکھی تھیں، بدقسمتی سے اس پریس میں آگ لگ گئی۔ پریس کا سارا ذخیرۂ کتب جل گیا اور ان کے مراثی بھی باقی نہ رہے۔ اس کے بعد انھوں نے طویل مرثیوں کے بجائے عزائی نظموں اور سلاموں پر زور دیا اور ان سلاموں سے عزائی شاعری کی نئی تعبیروں کو جنم دیا اور یہ ان کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ وہ جانتے تھے کہ انیس اور دبیر نے مرثیے کو جس بام عروج پر پہنچا دیا تھا اب اس میں ان سے بہتر کچھ کرنے کا امکان کم کم ہی ہے۔ حضرت سیماب کی جدت پسندی نے سلاموں اور عزائی نظموں میں نئی نئی زمینیں اور نئے نئے موضوعات تلاش کیے۔ محض گریہ انگیزی نہیں کی بلکہ المیہ سے تزکیہ کا کام لیا اور قوم کے اعلیٰ اور انسانی جذبات کو ابھارنے کی کوشش کی۔ انھوں نے قوم کی زبوں حالی، تباہی اور بربادی، فلاکت و ادبار اور فتنہ و فساد جیسی نحوستوں کو دور کرنے کے لیے حضرت امام حسینؓ کے اخلاق اور اوصاف حمیدہ کو ضروری قرار دیا۔ ان کا خیال تھا کہ فسق و فجور کی ارزانی، خودروی، بتان رنگ و بو کی غلامی اور دین و ضمیر فروشی کی لعنتوں سے نجات حاصل کرنے کے لیے وقت کو پھر حسینؓ کی ضرورت ہے تاکہ دنیا کی از سر نو تنظیم ہو سکے:

غلط کہ وقت کی تجدید فرض عین نہیں
یزید اب بھی ہیں لاکھوں، کوئی حسینؓ نہیں
توحید کی اک برق جہندہ ہیں حسینؓ
الحاد کے برباد کنندہ ہیں حسینؓ
ہے ظالم و مظلوم کے انجام میں فرق
مردہ ہے یزید اور زندہ ہیں حسینؓ

حضرت سیماب اکبرآبادی کی عزائی شاعری کے دو چھوٹے چھوٹے مجموعے 'سرود غم' اور 'نفیر غم' شائع ہو کر اتنے مقبول ہوئے کہ ان کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہوئے لیکن ان دونوں کتابوں کو ان کے عزائی کلام کا مختصر انتخاب کہا جاسکتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

itsurdu.blogspot.com

غمِ حسین مقدر سے مل گیا سیماب
ہزار شکر کہ دل میں غمِ جہاں نہ رہا
سجاد اسیر جور ہوئے افسوس کسی نے یہ نہ کہا
یہ پاؤں ستونِ کعبہ ہیں زنجیر کے پہناتا ہے

حضرت سیماب نے مناظموں کی طرح مسالموں کو بھی رواج دیا جو طرحی اور غیر طرحی دونوں طرح کے ہوتے تھے۔ محرم میں ان کی دیگر مصروفیات بھی ہوتی تھیں، آگرہ میں ہر سال محرم کی سات تاریخ کو مختلف ''سلام خواں پارٹیاں تعزیوں کے ساتھ سلام خوانی کرتی ہوئی چلتی تھیں اور خاص محلوں اور بازاروں میں ان کا گشت ہوتا تھا۔ ہر پارٹی کے ساتھ سننے والوں اور مداحوں کا ہجوم ہوتا، سڑکوں، چھتوں اور چھجوں میں مردوں، عورتوں اور بچوں کی بھیڑ عجیب سماں پیدا کرتی تھی، ہر پارٹی کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ وہ حضرت سیماب سے تازہ سلام حاصل کرلے کیونکہ ان کا سلام پڑھنا باعث اعزاز سمجھا جاتا تھا۔ عاشورہ کی صبح آفتاب موسیقی استاد فیاض خاں مرحوم بھی بطور خاص حضرت سیماب سے سلام حاصل کرکے اپنے خاندان کے دیگر فنکاروں کے ساتھ تعزیے کے گشت کے ساتھ پڑھا کرتے۔ لوگ ان سے اس سلام کی فرمائش ضرور کرتے۔

صبح عشرہ ہے سلامی کربلا والے چلے
گھر لٹا کے، سر کٹا نے مصطفیٰ والے چلے
تشنہ لب، زخمی بدن، صبر و رضا والے چلے
ختم کرکے مشکلیں مشکل کشا والے چلے

مختصراً یہ کہ حضرت سیماب نے عزائی شاعری کو نئی جہتیں دینے کی کوشش کی۔ ان کے ایک مشہور ترین سلام سے چند اشعار کے ساتھ اپنی بات ختم کروں گا:

فلک پر چاند نکلا مجرئی کا ہیدہ کا ہیدہ
جبیں سائیدہ سائیدہ، نظر دزدیدہ دزدیدہ
اداحق عزا کیا کیجیے، اب تو یہ حالت ہے
نفس تنقیدہ تنقیدہ، صد الغزیدہ لغزیدہ
خدائی کا یہ عالم، الاماں، ماہ محرم میں
زمیں آزردہ آزردہ، فلک رنجیدہ رنجیدہ
شب عشرہ تھی یا شامِ قیامت تھی، معاذ اللہ
ستارے چرخ پر نکلے مگر ترسیدہ ترسیدہ
نہ جانے شورشیں پنہاں ہیں کتنی ذرے ذرے میں
کہ خاکِ کربلا ہے آج تک شوریدہ شوریدہ
غمِ شبیرؑ میں سیماب کچھ لکھیے تو کیا لکھیے
سرِ قرطاس چلتا ہے قلم ژولیدہ ژولیدہ

افسانہ، ڈراما اور ناول

یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ حضرت سیماب اکبرآبادی نے باقاعدہ افسانہ نگاری اور ناول نگاری کی اور کئی ڈرامے بھی تحریر کیے۔ غالباً 1940 کے آس پاس انھوں نے ان دونوں اصناف ادب سے خود کو الگ کرلیا تھا اور شاید اس کا سبب ان کی بے پناہ مصروفیات تھیں۔ ان کے افسانے پیمانہ، تاج، شاعر اور دیگر معاصر رسائل میں شائع ہوتے رہے اور ان کی تعداد اتنی اچھی خاصی تھی کہ انھوں نے افسانوں کا ایک مجموعہ 'اساطیر' کے نام سے مرتب بھی کرلیا تھا جو شائع نہیں ہوسکا اور اس کا مسودہ بھی ضائع ہوگیا لیکن وہ افسانے ان پرانے رسائل کی فائلوں میں اب بھی محفوظ ہوں گے۔ ان کے افسانوں کے تعلق سے بابو ہرگوبند دیال نشتر اپنے مضمون 'ہندوستان کا پہلا قادر الکلام ادیب' (مطبوعہ 'شاعر' آگرہ اسکول نمبر 1937) میں لکھتے ہیں:

> ''تقریباً ہر رسالہ اور ہر اخبار آپ کے افسانوں کا حامل ہے۔ آپ کے افسانوں کا رنگ اس قدر مضبوط اور اس قدر دل آویز ہے کہ ملک آپ کے ہر افسانہ پر داد تحسین دیے بغیر نہیں رہتا۔ آپ اپنی جدت طبع اور اختراعی قوتوں کو یہاں بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ پلاٹ میں باہمی ربط، زبان کی عمدگی، واقعہ نگاری کے پہلو، تخیل کا زور، الفاظ کی مناسبت اور نفسیات کی تحلیل اس عمدگی سے افسانوں میں نظر آتی ہے کہ ہر افسانہ کو بار بار پڑھنے کے بعد بھی سیری نہیں ہوتی۔''

یہ میری اپنی کم علمی ہے کہ ان کے افسانوں کے تعلق سے زیادہ کچھ درج نہیں کرسکا لیکن بہرحال یہ ایک دلچسپ پہلو ہے حضرت سیماب کی ہمہ جہت شخصیت کا، جس پر اب تک کوئی کام نہیں ہوا۔ عجیب بات یہ ہے کہ ایسا ہی کچھ معاملہ ان کے ڈراموں کا بھی ہے۔

برسوں پرانی بات ہے کہ ایک بزرگ نے، جن کا تعلق ادب سے نہیں تھا، مجھے بتایا تھا کہ 'الفریڈ تھیٹریکل کمپنی، (ممبئی) سے حضرت سیماب کا ایک ڈرامہ'... عرف مصر کی جنگ

itsurdu.blogspot.com

کھیلا جاتا تھا۔ اس کا صحیح نام میں بھول چلا ہوں۔ اور ایسے کسی ڈرامے کا ذکر بھی مجھے کسی کتاب یا رسالے میں نہیں ملا۔ البتہ خود حضرت سیماب نے 'کلیم عجم' میں اپنی غیر مطبوعہ تصانیف کی فہرست میں ڈراما 'کلجگ' کا ذکر کیا ہے۔ راز چاند پوری مرحوم نے 'داستانِ چند' میں ان کے دو ڈراموں کا ذکر کیا ہے جن کے مسودے خود انھوں نے دیکھے تھے لیکن وہ ان ڈراموں کے نام بھول گئے۔ 'شاعر' آگرہ اسکول نمبر سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے (1937 تک) گیارہ ڈرامے لکھے تھے جن میں سے ایک کا نام 'کرشن کنول' تھا، ان میں سے بیشتر کولکاتا اور ممبئی میں اسٹیج بھی ہوئے اور کچھ شائع بھی ہوئے۔ مزید یہ کہ انھوں نے ایک فلم کی اسکرپٹ بھی لکھی تھی۔

ماہنامہ شاعر ممبئی کے ہم عصر اردو ادب نمبر (مئی تا دسمبر 1997) میں 'مطبوعات و مخطوطاتِ سیماب' کے عنوان سے حضرت سیماب کی تصنیفات کی ایک فہرست افتخار امام صدیقی صاحب نے مرتب کی۔

مذکورہ ڈراموں کے تعلق سے کیا کچھ لکھا گیا اور ان کے محاسن و معائب کیا تھے یا ان کی ادبی حیثیت کیا ہے، ہے بھی یا نہیں یہ راقم الحروف کے لیے بس ایک سوالیہ نشان ہی ہے۔

حضرت سیماب کے غیر مطبوعہ اور مطبوعہ ناولوں کی صحیح تعداد کیا ہے، پتہ نہیں۔ افتخار صاحب کی فہرست میں مطبوعہ ناولوں کی مختصر معلومات درج ہے۔ افسانوں، ڈراموں اور ناولوں کی تمام دستیاب تفاصیل کتاب ہذا کے باب 'تصنیفات سیماب' میں درج کر رہا ہوں، یہاں اُن سب کا ذکر ممکن نہیں۔

عصر حاضر کا محقق و نقاد مذکورہ بالا افسانوں، ڈراموں اور ناولوں کے بارے میں کیا لکھے گا جب کہ اس کے پیش رو حضرت سیماب کے بارے میں چند رٹے رٹائے جملوں سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکے۔

○

شاعر کی راتیں

اپنی زندگی میں حضرت سیماب اکبرآبادی نے صرف آگرہ ہی نہیں بلکہ ملک کے گوشے گوشے میں مشاعرے پڑھے اور ان میں سے بیشتر مشاعروں کی صدارت فرمائی۔ جوں جوں ان کی مصروفیات میں اضافہ ہوتا گیا، انھوں نے مشاعروں میں شرکت کم کر دی تھی بلکہ مقامی مشاعروں میں تو بہت ہی کم جاتے۔ مشاعروں میں کم کم شریک ہونا ان کی بے پناہ مصروفیت کے سبب ہی تھا، ایسا ہرگز نہیں ہے بلکہ مشاعروں کے گرتے ہوئے معیار، غیر مہذب ماحول اور تفریحِ محض سے وہ کراہیت محسوس کرتے تھے، جوانی کے دنوں میں چھوٹے بڑے ہر مشاعرے میں بڑے شوق سے شرکت کرتے تھے، بلکہ پورے اہتمام کے ساتھ لیکن رفتہ رفتہ اتنے مشاعروں کے دعوت نامے آنے لگے کہ وہ اہتمام کچھ کم کم سا ہو گیا۔

1930 میں جب رسالہ 'شاعر' جاری ہوا، اس میں انھوں نے کئی سلسلے شروع فرمائے جن میں ایک نہایت دلچسپ سلسلہ تھا۔ 'شاعر کی راتیں' وہ ہر شمارے میں کسی ایک ایسے مشاعرے کا تذکرہ لکھتے جس میں وہ خود شریک ہوئے۔ یہ سلسلہ بہت مقبول تھا لیکن افسوس کہ تا حال 'شاعر' کی فائلوں میں بند ہے۔ اگر 'شاعر کی راتیں' کتابی صورت میں شائع ہو تو اس سے اس دور کے ادبی ماحول، شعرا اور مشاعروں کے مزاج اور تہذیب کا اندازہ ہو سکے گا۔ ذیل میں ان میں سے دو واقعات پیش ہیں:

> ''اجمیر شریف' میں بیدل صاحب کے یہاں مشاعرہ ہوا۔ بیدل صاحب شعر بہت اچھا کہتے تھے اور ان کا گریبان ہمیشہ کھلا رہتا تھا۔ غالباً جاورہ سے کوئی تعلق تھا۔ جوان تو تھے، یہاں مدار دروازے باہر ایک طوائف سے رسم ہو گئی، اکثر اس کے یہاں اٹھتے بیٹھتے تھے۔ خیر مشاعرہ ہوا میں بھی گیا۔ اثنائے مشاعرہ میں کسی نے میری غزل جیب سے صاف نکال لی اور کچھ دیر کے بعد میرے سامنے مشاعرہ میں پڑھنی شروع

itsurdu.blogspot.com

کر دی۔ لوگوں نے جن اشعار پر داد دی میں نے بھی دی۔ پڑھنے والے نے خوب جھک جھک کر آداب و تسلیم کی اور بڑے مطمئن لہجے میں غزل پوری کر دی۔ میں نے اسی حالت میں پندرہ شعر اور کہہ لیے اور جب میرا نمبر آیا تو غزل سنا دی۔ مشاعرہ ختم ہوگیا۔ دوسرے روز وہی صاحب میرے پاس آئے۔ اور کہنے لگے کہ میں نے آپ کا امتحان لیا تھا۔ آپ اس میں کامیاب ہوئے۔ اب میں آپ کا شاگرد ہوتا ہوں میں نے کہا یہ تو کوئی امتحان کی بات نہ تھی۔ کہنے لگے دوسرا شاعر ہوتا تو وہیں مچل جاتا کہ میری غزل مشاعرے میں پڑھی جارہی ہے۔ میں نے کہا اس کا کیا ثبوت تھا کہ وہ غزل آپ کی نہ تھی میری تھی۔ اشعار میں مصنف کی تصویر یا اشعار پر مصنف کی مہر تو ہوتی نہیں۔ جس سے ملکیت ثابت کی جاسکے، مگر وہ میرے اس مشرب سے برابر متاثر تھے، آخر شاگرد ہوگئے۔" (شاعر، مارچ اپریل 1935)

"اسلامیہ کالج میں عید پر مشاعرہ ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ اتفاق سے میں، اصغر صاحب گونڈوی، جگر مرادآبادی، مرزا یاس عظیم آبادی اور ساغر نظامی سب لاہور ہی میں موجود تھے۔ مشاعرہ میں ہم سب کو بہ اصرار و التزام مدعو کیا گیا۔ سر محمد شفیع مرحوم صدر مشاعرہ تھے۔ مرزا یاس کا نمبر آیا تو نام پکارا گیا۔ مرزا صاحب ڈائس پر پہنچے، ہال طلبہ اور سامعین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ کہیں تل رکھنے کو جگہ نہ تھی۔ مرزا صاحب کے آتے ہی فضا خاموش ہوگئی۔ مرزا صاحب نے شعر پڑھنے سے پیشتر پہلے حسب عادت گنگنانا شروع کیا، کسی قدر لے کے ساتھ۔ اس پر مجمع نے قہقہہ لگایا۔ صدر صاحب نے سب کو خاموش کیا اور مرزا صاحب سے فرمایا کہ ہاں بسم اللہ۔ مرزا صاحب نے پھر اسی لے کے ساتھ گنگنانا شروع کیا اور مجمع پھر غیر سنجیدہ ہوگیا۔ کسی نے کہا بھی کہ مرزا صاحب شعر پڑھیے گنگنائیے نہیں۔ آخر سر شفیع نے مجمع پر بمشکل پھر قابو پالیا اور جب سب خاموش ہوگئے تو مرزا صاحب سے کہا کہ ہاں بسم اللہ۔ مرزا صاحب نے اب بھی فضا کو نہ سمجھا اور بجائے غزل پڑھنے کے وہی لے کے ساتھ گنگنانا شروع کر دیا۔ مجمع پھر بے قابو ہوگیا۔ شور اور سیٹیوں سے ہنگامہ برپا ہونے لگا۔ اب کے تو صدر صاحب کو بھی ہنسی آگئی۔ سالک صاحب اور دوسرے حضرات بھی ہنسنے لگے۔ یہ حال دیکھ کر مرزا صاحب ڈائس سے اتر آئے اور جوتے بغل میں داب کر مشاعرے سے واپس چلے گئے۔ اصغر صاحب اور جگر صاحب نے بھی (غالباً ہم صوبہ ہونے کے خیال سے) ان کا ساتھ دیا۔ مگر ہم وہیں بیٹھے رہے۔" (شاعر، مئی، جون 1945)

خطبات شاعری

اس دور کے مذہبی اور سیاسی اجتماعات میں خطبۂ صدارت عام تھا لیکن مشاعروں کا حال کچھ مختلف تھا۔ مشاعروں میں عموماً سیاسی، مذہبی میدان کی مشہور شخصیات میں سے کسی کو صدر بنا دیا جاتا تھا، اب ایک شخص جس کا شین قاف تک درست نہ ہو، خطبۂ صدارت کیا پڑھتا۔ عموماً ایسا بھی ہوتا کہ کسی کہنہ عمر شاعر کو بزرگی کا لحاظ کرتے ہوئے صدارت دے دی جاتی، چاہے وہ فنِ شاعری، ادب کے موجودہ حالات و نظریات اور زبان و بیان کی باریکیوں سے واقف ہو یا نہ ہو۔ حضرت سیماب اکبرآبادی اس غیر شاعرانہ رواج سے بہت نالاں تھے وہ چاہتے تھے کہ مشاعرے کی صدارت کسی شاعر ہی کے سپرد کی جائے اور صدر مشاعرہ صدارتی خطبہ بھی پیش کرے۔ دراصل وہ مشاعروں میں صرف غزل خوانی اور رسمی داد و تحسین کے مخالف تھے اور اسے سستی تفریح کا ذریعہ بننے سے بچانا چاہتے تھے اسی لیے انھوں نے مشاعروں میں نظم پڑھنے کی بھی حوصلہ افزائی کی اور 'مناظمے' کو بھی رواج دیا۔

حضرت سیماب کی خواہش تھی کہ مشاعرے کا صدر علمی ادبی موضوعات پر صدارتی خطبہ پیش کرے جس میں اردو ادب اور خصوصاً شاعری پر بات ہو اور مشاعرے کا عام سامع اپنی علمیت میں اضافہ کرے۔ انھوں نے حوصلے اور ہمت سے کام کا آغاز کیا۔ اور سب سے پہلا خطبۂ صدارت 24 دسمبر 1922 کو گیا (بہار) کے کل ہند مشاعرے میں پڑھا اور اس طرح وہ مشاعروں میں خطبہ خوانی کے محرک اول ہیں۔

اپنی شاعرانہ زندگی میں حضرت سیماب نے کتنے مشاعروں میں شرکت کی، کتنے مشاعروں کی صدارت کی اور کتنے مشاعروں میں خطبہ صدارت پڑھا اس کا اندازہ لگانا ممکن ہی نہیں ہے لیکن 'کلیم عجم' طبع اول (1936) میں صرف چودہ خطبات شائع کیے گئے ہیں۔ مدیر 'شاعر' افتخار امام صدیقی صاحب کے مطابق دیگر چوبیس خطبات 'شاعر' اور دیگر رسائل میں

itsurdu.blogspot.com

شائع ہوئے مزید یہ کہ حضرت سیماب کے چھوٹے فرزند مظہر حسین صدیقی مرحوم کے پاس بہت سے خطبات کے مسودے موجود تھے جو انھوں نے حضرت مشفق خواجہ مرحوم کو اس غرض سے دیے تھے کہ وہ ان پر سیر حاصل مقدمہ لکھ دیں تاکہ اس قیمتی اثاثے کو کتابی شکل دی جا سکے۔ افسوس کہ دونوں ہی اصحاب اس دنیا میں نہیں رہے۔ بہرحال اب افتخار امام صاحب وہ مسودے حاصل کرنے کی کوشش میں ہیں۔

'کلیم نجم' میں شامل خطبات کا جائزہ لیتے ہوئے اس بات کا ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ مولانا حالی کے 'مقدمہ شعر و شاعری' کی زبردست دھوم مچنے کے باوجود اس کے بعد ایک طویل عرصے تک اردو تنقید، تفہیم اور تحقیق کے واضح خد و خال ابھر کر سامنے نہیں آ سکے تھے بلکہ یوں کہنا درست ہوگا کہ ہر اہل قلم نقاد تھا اور زیادہ تر تنقیدی مضامین معائب گردانے اور اپنی علمیت بگھارنے کے لیے لکھے جاتے تھے۔ مولانا حالی نے شاعری میں نئے رجحانات پر زور دیا۔ یہی نہیں بلکہ 'مقدمہ شعر و شاعری' علمی، لسانی اور فنی معلومات کا ایک بڑا خزانہ ہے۔ حضرت سیماب کے 'خطبات شاعری' کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ یہ خطبات دراصل مولانا حالی کے مقدمے کی توسیع ہیں لیکن نقل بہرحال نہیں کیونکہ مقدمہ ایک مبسوط کتاب ہے جب کہ خطبات پندرہ برسوں میں مختلف حالات اور مختلف اذہان کے لیے کی گئی علمی اور ادبی تقریریں ہیں، گو کہ دونوں میں بہت حد تک موضوعات کی ہم آہنگی ہے لیکن 'خطبات شاعری' میں ہندوستان کی سیاسی، سماجی اور ادبی تاریخ بھی ضمناً آ گئی ہے۔ دونوں میں ایک بنیادی فرق یہ بھی ہے کہ مولانا حالی نے دیگر مصنفین کے بیان کردہ ادبی اور شعری رجحانات کو جابجا بطور سند پیش کیا ہے اور ان پر بہت زیادہ اعتماد بھی کیا ہے جب کہ حضرت سیماب کی اپنی ترجیحات ہیں، اپنے نظریات اور تیقنات ہیں جو انوار مستعار نہیں بلکہ ذاتی تجربات و مشاہدات کا نچوڑ کہے جا سکتے ہیں۔ یہاں 'خطبات شاعری' کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ یہ صرف ان اہم ترین خطبات کا تذکرہ ہے جو حضرت سیماب کے علم و دانش کے مظہر ہیں۔

سب سے پہلا خطبۂ صدارت کانگریس کے اجلاس منعقدہ گیا (بہار) کے مشاعرے

میں پڑھا گیا۔ اس کے آغاز میں 'آل انڈیا قومی مشاعرۂ احمد آباد' کا ذکر کرتے ہوئے حضرت سیماب نے قومی شاعری کی اہمیت اور ضرورت پر زور دیا۔ فہرست میں دیگر موضوعات خطبہ یوں درج ہیں: شاعر اور تبصرۂ حیات ہندوستان کے سب سے پہلے قومی شاعر، شاعر اور قومیات۔ رزمگاہ، انگورہ اور نصرتی۔ ملکی اور قومی انجمنوں میں شاعر کی ضرورت۔ اس خطبے میں انھوں نے قومی شاعری کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے ملک کی تحریکوں میں شعرا کی شمولیت پر زور دیا۔

دوسرا خطبہ 5 اپریل 1930 کو مشاعرۂ آگرہ میں پڑھا گیا۔ اس کے عنوانات یہ ہیں: خطبۂ صدارت کی ترویج، مبتدی اور منتہی شعرا کی مشارکت، آگرہ کی شاعرانہ افضلیت، آگرہ اور دہلی کا شاعرانہ تعلق، شعرائے آگرہ سے اپیل، مناظمہ۔ دورانِ خطبہ حضرت سیماب فرماتے ہیں:

> "حضرات! مشاعرے کی داد و تحسین کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ اس رسمی مطالبۂ نفس کی پروا نہ کیجیے۔ قدرت کلام یہ ہے کہ جب شعر کا نغمہ آئے تو پڑھنے والا چند منٹ تک اپنی نگاہ اس سے ہٹا نہ سکے۔ اس کی نگاہ میں اس کا دل سمٹ کر آ جائے، اور جو کچھ آپ نے کہا ہے وہ نگاہوں کے راستے دل میں اتر جائے۔"

امراوتی (برار) کے مشاعرے منعقدہ 29 نومبر 1930 میں تیسرا خطبہ پڑھا گیا۔ اس خطبے کے موضوعات بڑے اہم ہیں۔ برار کی تاریخی و ادبی اہمیت۔ شاعری کا اثر نظام حیات پر۔ عہد عتیق اور شاعری۔ اردو شاعری فارسی شاعری کے نقش قدم پر۔ اردو شاعری اور 'غیر فطری جذبات۔ طالب علم شاعری کا غلط اصول زندگی، غزل اور تغزل کی تشریح تقلید محض کی لعنت، شعر کی تعریف، کالجوں اور اسکولوں کے مشاعرے۔ شاعری اور ماحولی خصوصیات۔ اس خطبے کا ایک اقتباس دیکھیں:

> "لیکن میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ آخر تقلید ہی ہمارا نصب العین کیوں ہو؟ ہم اپنے ذہنوں کو دوسروں کے دل و دماغ سے نکلی ہوئی پیداوار کی جگالی کے لیے مجبور کیوں کیے ہوئے ہیں اور ہم بیگانوں کے نقش قدم پر چلنے کو تدبیر منزل کیوں سمجھے ہوئے ہیں؟ کیا ہندوستان کا ماحول ہماری شاعرانہ اور تخیلی تشنگی کو نہیں بجھا سکتا؟"

itsurdu.blogspot.com

چوتھا خطبہ مشاعرہ ڈیرہ دون کا ہے جو حضرت سیماب نے 13 دسمبر 1930 کو پڑھا۔ اس کے موضوعات ہیں : مشاعروں میں خطبۂ صدارت۔ عربی علم عروض، ہندی قواعد شاعری۔ سید انشا اور عروض۔ اردو میں قواعد شاعری کی ضرورت۔ ایطا۔ جمعیۃ الشعرا کے قیام کی ضرورت۔ ایرانی شاعری میں انقلاب۔ ہندوستانی شاعری اور تحریک وطن۔ موجودہ ذہنیت اور قواعد وضوابط میں انقلاب کی ضرورت۔

پانچواں خطبہ 26 دسمبر 1931 کو مشاعرہ ڈبائی میں پڑھا گیا جس کے موضوعات یوں ہیں : خطبہ خوانی کا غلط مصرف، اردو شاعری، غلط نظریہ، غلامانہ ذہنیت، شاعری اور مصوری، شاعر کے مدارج بلحاظ اثر، مشاعرے اور دور آزادی، اسباب قبولیت، رسمی و نشاطی شاعری، مشاعروں کی اصلاح عام شاعری اور مشاعرے، جدید نظام عمل، ماضی و حال۔ شاعر کی عظمت، تلخ خوانی کی معذرت۔

'شاعری اور مشاعرے کی اصلاح' چھٹے صدارتی خطبے کا عنوان ہے جسے حضرت سیماب نے انٹرمیڈیٹ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں 27 فروری 1932 کو پڑھا جس میں شاعری اور مشاعروں کی اصلاح، مروجہ اقسام شاعری، محاورات، مصطلحات اور اسالیب بیان کا تحفظ میر و سودا اور غالب و مومن، اساتذۂ متقدمین کے دیوانوں کا تجزیہ۔ بدعات مشاعرہ۔ مشاعروں کی اصلاح کیوں کر ہو۔ شاعر اور مشاعروں میں انقلاب پیدا کرنے کی عملی تدبیر، جمعیۃ الشعرائے ہند کی تحریک جیسے موضوعات پر اظہار فرمایا۔

ساتواں خطبہ 16 اپریل 1933 کو مشاعرۂ بزم ادب جہلم (پنجاب) میں پڑھا گیا جس کے مشمولات یہ ہیں۔ علم و ادب، ادب اردو، مشہور شعرائے اردو کے چھ دور بلحاظ ترقی زبان، فارسی کا اثر اردو پر، ادب کا مواد اور مقصد و منشا۔ قدیم و جدید ادب، نموئے ادب کے وسائل، شعر میں ادب کی جگہ ملک کی اجتماعی زندگی پر ادب کا اثر۔ حیات قومی میں ادبیات کا حصہ، علم و ادب کی تبلیغ و خدمت کے ذرائع۔ مستقبل کے متعلق مشورہ۔

'کلیم عجم' میں آٹھواں خطبۂ صدارت مشاعرۂ بزم ادب کاندھلہ ضلع مظفر نگر کا ہے جو 28 اکتوبر 1933 کو منعقد ہوا۔ اس کے موضوعات یوں ہیں : اردو شاعری کی ترقی اور معیار۔

مشاعرے، شعرا کی بے قدری و کسمپرسی، اس کا علاج، صدارت ناقص، مشاعرے کا غلط ماحول، خودرو شعرا کی اصلاح، محاکے کی ضرورت، غزل کا معیار۔ غزل کی زبان۔

نویں خطبے کا عنوان 'غزل' ہے۔ کہاں پڑھا گیا درج نہیں ہے البتہ 'محررۂ دسمبر 1935' تحریر ہے۔ اس میں جن موضوعات پر اظہار خیال فرمایا گیا وہ یہ ہیں : غزل کی صنفی خصوصیت۔ عرب کے بعد عجم میں، ہندوستان اردو شاعری سے پہلے، غزل ہندوستان میں، غلط مبحث، اقدام اصلاح، حکومت کا اثر غزل پر، دور غالب، مرزا داغ اور امیر و جلال کا زمانہ، حالی اور آزاد کا اثر غزل پر، غزل کا ارتقا، ایک مترنم انقلاب۔ حالی اور ان کے معاصرین، غزل کے قدیم موضوعات، غزل کا جدید رنگ، غزل اور واردات و جذبات ایک ضروری مشورہ۔ اس خطبے میں حضرت سیماب فرماتے ہیں :

> "تاثیر صرف اسی شعر میں پیدا ہوسکتی ہے جو شاعر کے دلی جذبات کا آئینہ اور اس کی کیفیات حقیقی کا ترجمان ہو۔ جب تک کہنے والا اپنے کلام کا اثر خود اپنے دل اور دماغ پر محسوس نہ کرے اس وقت تک وہ دوسروں کی سماعت کو متاثر نہیں کرسکتا۔ ہمیں محسوس شاعری کی ضرورت ہے۔ مفروضہ خیالات کے اظہار کی ضرورت نہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ طرز پُر اثر، پیرایہ متین، اسلوب نیا، طریقہ اچھوتا، زبان نہ ملایانہ، نہ بازاری، روزمرہ درست، محاورات برمحل، ترکیب چست، الفاظ بے ساختہ اور جملے شستہ ہوں کہ نہ حرف دبے، نہ زبان الجھے، نیز تنقیدی مضامین اور عام موضوعات سے احتراز ہونا چاہیے۔"

آل انڈیا مشاعرۂ کانپور 2 دسمبر 1935 میں حضرت سیماب نے 'اردو شاعری پر ایک تنقیدی نظر' کے عنوان سے دسواں صدارتی خطبہ پڑھا۔ اس کے ذیلی عنوانات ملاحظہ فرمائیں : شاعری کا معیار، ادارہ ہائے شاعری اور ان کی شاخیں، آگرہ اسکول، آگرہ اسکول کی خصوصیات، حریفان کم مایہ، اردو شاعری کا ایک اور نقص، تقلید و قدامت پرستی، تنقید کا غلط معیار، موجودہ شاعر کا عملی کیریکٹر اور مشاعرے۔ موجودہ شاعری کے نمونے عصر حاضر سے عصر قدیم کا موازنہ۔ نظم گوئی کا رواج۔

انجمن ترقی اردو سینٹ جانس کالج آگرہ کے مشاعرے میں 9 فروری 1934 کو

itsurdu.blogspot.com

گیارہواں خطبہ پڑھا گیا جس کا عنوان ہے 'ہندوستانی یونیورسٹیاں اور ادب اردو'۔ اس خطبے کے ذیلی عنوانات یوں ہیں : اردو زبان کی عالمگیری، مشاعروں کی افادیت، کالجوں کے مشاعروں اور ادبی مجالس کی اہمیت، طلبا اور شاعری، یونیورسٹیوں کی ادب اردو سے بے اعتنائی، یونیورسٹیاں کیا کر سکتی ہیں، تعلیم میں اردو کی ضرورت بحیثیت مادری زبان کے، نصاب تعلیم میں معیاری ادب کی ضرورت، ادبائے اردو کی ہمت افزائی، مدیرانِ نصاب کی مردہ پرستی، کالج کی لائبریریاں، کالجوں کے رسالے، کالجوں کے مشاعروں کا معیار۔ خاتمہ

بارھواں خطبہ مشاعرہ بزم اردو لشکر (گوالیار) میں 28 فروری 1934 کو پڑھا گیا جس کا عنوان 'اردو' ہے۔ اس کے تحت ذیل کے موضوعات شامل ہیں : چند لمحے ماضی میں۔ توضیح حال، اردو کی عامیت اور صوبہ جاتی گیرائی، اردو کس کی زبان ہے، اردو زبان کے خصائص، مصطلحات اردو، قوتِ انجذاب، اردو بحیثیت اخباری زبان کے، اردو زبان کی علمی حیثیت، اردو کا تجارتی وزن، اردو اور سیاست، اردو اور شاعری، اردو کی تصنیفی قوتیں، اردو میں تاریخ و سیرت نگاری، اردو کا اخلاقی استحکام، اردو کا مذہبی اقتدار، اردو کی بین الاقوامی حیثیت، اردو کے مستقبل پر ایک نظر۔

تیرہواں خطبہ درباری مشاعرہ، منعقدہ درگاہ حضرت شاہ ولایتؒ، نائی منڈی آگرہ میں 2 مارچ 1934 کو پڑھا گیا۔ اس کے ذیلی عنوانات یہ ہیں : اربابِ طریقت اور شاعری، آگرہ کے صوفی شعرا، تصوف اور اردو شاعری۔

چودھواں صدارتی خطبہ مشاعرۂ بزم ادب اورئی ضلع جالون منعقدہ 5 جون 1935 کا ہے۔ اس کے عنوانات یہ ہیں : اورئی کا ادبی جغرافیہ، شاعری اور بقائے عمرانیت، شاعر کا تفوق جنسی، موجودہ شاعری اور تنوع خیال، آخری گزارش۔

ان خطبات کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کسی صدر مشاعرہ کی رسمی تقاریر نہیں بلکہ تحقیق و تنقید کے اعلیٰ ترین نمونے ہیں۔ ان میں تاریخ، سماجیات، نفسیات، نظریات، فلسفہ، اصلاحی رجحانات اور عمیق مطالعے کو سمو دیا گیا ہے۔ شستہ، معیاری اور سہل زبان میں ان خطبات کو تصنیف کیا گیا تا کہ مشاعرے کا عام سامع اکتا نہ جائے اور ظاہر

ہے کہ اگر اس بات کو ملحوظ نہیں رکھا جاتا تو ممکن ہے کہ دو چار خطبوں کے بعد ہی یہ سلسلہ دم توڑ دیتا لیکن شواہد ہیں کہ عوام کو ان خطبات میں ویسا ہی لطف و انبساط حاصل ہوتا تھا جیسا غزل سن کر ہوتا تھا۔ ممکن ہے کہ حضرت سیماب اگر ان خیالات کو تنقیدی کتاب کی شکل دیتے تو اس میں مزید علمی اضافے ہوتے لیکن عوام کے لیے ادبی موضوعات پر اظہار خیال کوئی عام بات نہیں۔

بارہ تیرہ برسوں میں حضرت سیماب نے کئی مشاعروں کی صدارت فرمائی ہوگی لیکن 1922 سے 1935 تک صرف چودہ خطبات کا انتخاب کیا جانا بھی اہمیت کا حامل ہے۔ ان خطبات میں سے بہت سے اقتباسات نقل کرنا چاہتا تھا لیکن ایک چھوٹی سی کتاب میں سب کچھ ممکن کہاں۔

○

itsurdu.blogspot.com

تلامذہ اور اصلاحِ سخن

فصیح الملک داغ دہلوی کے تقریباً ڈیڑھ ہزار شاگرد تھے ان میں سے ڈاکٹر اقبال اور حضرت سیماب شہرتوں کے جن مقامات پر فائز ہوئے وہ دیگر شاگردوں کے نصیب میں نہیں آئے۔ شاگردوں کے معاملے میں خود حضرت سیماب اپنے استاد سے بھی بہت آگے نکل گئے۔ حضرت سیماب اکبرآبادی کے تلامذہ کی صحیح تعداد کا تو پتا نہیں لیکن ایک اندازے کے مطابق ان کی کل تعداد تین ہزار کے قریب تھی، جہاں تک میرا مطالعہ ہے، غالباً تلامذہ کی اتنی بڑی تعداد اردو شاعری میں کسی استادِ فن کو نصیب نہیں آئی۔ ان کے شاگرد صرف ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ ایک کثیر تعداد میں بیرونِ ملک بھی مقیم تھے۔ بیشتر تلامذہ بذریعۂ خط و کتابت فیضیاب ہوتے تھے۔ خود حضرت سیماب کا یہ عالم تھا کہ خطوط کے جوابات اور اصلاحِ کلام میں کبھی تاخیر نہیں کرتے تھے۔

حضرت سیماب کے سب سے پہلے شاگرد امیرالدین نظر اکبرآبادی تھے، پھر تو یہ سلسلہ اتنا دراز ہوا کہ کئی ایسے شعرا نے ان سے اصلاح لی جن کے نام بعد میں اساتذہ کی فہرست میں شمار ہوئے اور کئی بے حد مقبول ہوئے۔ اس عظیم کارواں میں ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی، پارسی، جین اور بودھ سبھی مذاہب کے شاعروں اور شاعرات کے نام شامل ہیں۔

اصلاحِ سخن کوئی آسان کام نہیں ہے، ایک غزل یا ایک نظم کی اصلاح میں اتنی ہی قوت و صلاحیت خرچ ہوتی ہے جتنی ایک نظم یا غزل کہنے میں۔ حضرت ظ۔ انصاری نے حضرت سیماب کے تعلق سے ایک ٹیلی ویژن پروگرام میں یہی بات کہی تھی کہ "مولانا نے اگر ایک شاگرد کی صرف ایک نظم یا ایک غزل پر ہی اصلاح دی ہو تو تین ہزار نظمیں غزلیں تو یوں ہی کہہ لیں، حیرت ہے کہ انھوں نے اتنا تخلیقی کام کیسے کیا۔" یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ کئی شاگرد حضرت سیماب کی عنایتوں کی بدولت ہی شعرا میں شمار ہوئے بلکہ کئی شاگردوں کے

پورے پورے شعری مجموعے استادِ مکرم کی دین ہیں، یہ صرف حضرت سیماب ہی کا عمل خاص ہوا ایسا نہیں ہے، بیشتر اساتذہ کو ضروریاتِ زندگی نے اس کام کے لیے مجبور کیا ہوگا اور کیسی کیسی تخلیقات غیر معروف شاگردوں کے نام سے چھپ کر ضائع ہوگئی ہوں گی۔ یہ ایک المیہ ہے اور صرف افسوس ہی کیا جاسکتا ہے۔

حضرت سیماب کے تلامذہ میں بہت سے خود استادِ سخن ہوئے۔ کئی شعرا بہت مشہور ہوئے اور آج بھی تلامذہ سیماب سے فیضیاب ہونے والے تلامذہ کی بڑی تعداد موجود ہے۔ ان چراغوں سے کئی چراغ روشن ہوئے اور ہوتے رہیں گے۔ عموماً تلامذۂ سیماب خود کو 'سیمابی' لکھتے تھے۔ ان کے نامور شاگردوں میں نازش پرتاپ گڑھی، اعجاز صدیقی، راز چاند پوری، بسمل سعیدی، شفا گوالیاری، قمر نعمانی سہسرامی، طرفہ قریشی، الم مظفرنگری، ساغر نظامی، مختار صدیقی، مخمور جالندھری، سراج الدین ظفر، الطاف مشہدی، صبا متھراوی، خموش سرحدی، شہ زور کاشمیری، لطیف انور، ضیا فتح آبادی، محمد صادق ضیا، آغاز، برہان پوری، رونق دکنی، منظر صدیقی، نثار اٹاوی، ابوالمجاہد زاہد، نور بجنوری، طالب کاشمیری، افسر احمد نگری، اثر اکبرآبادی، ارمان آفریدی، حسامی مانک پوری، ابد سرہندی، جسونت رائے رعنا، علیم اختر مظفرنگری، احمد شجاع پاشا، مبشر علی صدیقی، بلقیس جہاں شیریں، نشاط کشتواری، عبدالرزاق سعید، حبیب اشعر، نعمان تاثیر، جالب مظاہری، میرا حدی اجمیری، شفق تاثیر صحرائی، خنداں جہلمی، مفتوں کوٹوی، نذیر شیر کوٹی وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں۔

تلامذہ سیماب کے بھی کئی شاگرد یا ان کے فرزندان آج اردو ادب کے اہم ناموں میں شمار ہوتے ہیں۔ یہ ایک بڑا تحقیق طلب کام ہے۔ سردست میں صرف تین پیش کر رہا ہوں مخمور سعیدی، افتخار امام صدیقی اور عبدالاحد ساز لیکن میں جانتا ہوں کہ اس فہرست میں بھی بہت سے نامور ادب شامل ہوں گے۔

اس دور میں اردو شاعری اور خصوصاً غزل تفریح محض ہو کر رہ گئی تھی۔ حضرت سیماب اکبرآبادی نے نہ صرف خود بلکہ اپنے ہزاروں شاگردوں کے ذریعے 'شعرِ مہذب' کو رواج دیا، غزل میں نقش نگاری، لفظوں کی بازی گری، گل و بلبل، ہم جنسیت، چھیڑ چھاڑ اور دیگر

itsurdu.blogspot.com

اخلاق سوز موضوعات کی مخالفت کرتے ہوئے فکر، فلسفہ، نفسیات اور احوالِ واقعی کو جگہ دی، یہ جدید شاعری کے ابتدائی نقوش تھے، بعد میں زبان و ادب کو اس سے کیا فیض پہنچا یہ الگ موضوع ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ روایتی تفریحی شاعری کے شیدائیوں اور فرسودگی سے جونک کی طرح چپکے ہوئے اس عہد کے اساتذۂ سخن کو یہ سب کچھ ہضم نہیں ہوا اور حضرت سیماب اور ان کے تلامذہ کے خلاف ایک محاذ بن گیا، اس مخالفانہ لہر کا حضرت سیماب کی شخصیت پر تو کوئی اثر نہیں ہوا لیکن ان کے بعض تلامذہ سستی شہرتوں کی لالچ میں اپنے استاد سے بدظن بھی ہوگئے۔ بہرکیف استاد خود کبھی اپنی معنوی اولاد سے بددل نہیں ہوئے۔

حضرت سیماب ابتدا میں تو (جب چند ہی شاگرد تھے) اپنے تلامذہ کی پوری پوری بیاضوں پر اصلاح فرما دیتے تھے لیکن جب شاگردوں کی تعداد سیکڑوں میں نہیں بلکہ ہزاروں میں ہوگئی تو انھوں نے پابندی لگا دی کہ ایک وقت میں صرف ایک غزل یا ایک نظم ہی بطور اصلاح بھیجی جائے، اس کی کئی وجوہ تھیں، اول تو یہ کہ شاگردوں کی کثیر تعداد تھی، پھر خود ان کے اپنے تخلیقی کاموں پر بھی توجہ دینی تھی، گھر کی کفالت بھی کرنی تھی اور قلم چلا کر ہی روپیہ کمانا تھا، شاگردوں سے مالی منفعت برائے نام ہی رہی ہوگی، گو کہ حضرت ضیا فتح آبادی نے اپنی دونوں کتابوں 'ذکرِ سیماب' اور 'سیماب بنام ضیا' میں حضرت سیماب کو نہایت مفلوک الحال اور شاگردوں کا محتاج ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے لیکن یہ بات درست نہیں ہے اور اگر وقتاً فوقتاً ان کے مالی حالات خراب ہوئے بھی تو اس کی کئی وجوہ میں ایک وجہ ان کے شاگرد بھی تھے۔ 23 مارچ 1935 میں انھوں نے ایک مکتوب میں خود ضیا صاحب کو لکھا:

> "... مجبور ہوں کہ قصر الادب ہندوستان میں ایک مستند مرکزیت حاصل کر چکا ہے۔ تلامذہ کا مرجوعہ بڑھتا جا رہا ہے اور اسی کے ساتھ میری پریشانیاں بھی۔ اس لیے کہ تمام وقت اصلاح و مشورت ہی میں ختم ہو جاتا ہے۔ اصلاح کے علاوہ ادبی استفسار اس قدر آتے ہیں کہ شاید کسی مفتی اعظم کے پاس مذہبی فتوے بھی اتنے نہ آتے ہوں۔ ان واقعات کے ماتحت اقتصادی حالات روز بروز خراب ہوتے جا رہے ہیں اور کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر مجھے کیا کرنا چاہیے۔"

مکتبہ قصر الادب سے بیک وقت تین چار رسائل و اخبارات شائع ہوتے تھے جن پر

توجہ دینا بھی ان کے لیے ضروری تھا، لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ وہ ہر شاگرد پر اپنی مصروفیات کے سبب کم کم توجہ کرتے تھے بلکہ اگر کسی شاگرد کا کوئی دیوان یا مجموعہ مرتب ہوتا تو وہ اسے کامل طور پر دیکھتے اور ضرورت کے مطابق اصلاحیں بھی فرماتے۔

عموماً وہ شعر کی اصلاح کے ساتھ توجیہہ نہیں لکھتے تھے۔ اس میں ان کی بے پناہ مصروفیت کے ساتھ ساتھ یہ بھی مقصود تھا کہ شاگرد اصلاح کی وجہ پر غور کرے اس طرح ان کے تلامذہ زبان، لغت اور اساتذہ کے دواوین سے استفادے کے عادی ہو جاتے تھے اور روحِ اصلاح پر غور کرنے سے ان کی ذہنی تربیت ہوتی تھی۔ مزے کی بات یہ کہ شاگردوں کی اصلاح کا یہ طریقہ اس وقت عجیب سا لگتا ہوگا لیکن آج اسکولوں اور کالجوں میں اسی طرح تعلیم دی جاتی ہے۔ ہاں شاگردوں کی ذہنی تربیت کے لیے فنی نکات، صحتِ زبان اور اساتذۂ ماضی کی اصلاحوں پر توجیہات باقاعدہ 'پیانہ' اور 'شاعر' میں شائع ہوتی رہتی تھیں اور پھر 'رازِ عروض' اور 'دستور الاصلاح' جیسی کتابوں کے ذریعے حضرت سیماب نے تلامذہ کے لیے ایک طرح کا 'نصابِ شاعری' تحریر فرما دیا تھا۔

ان کا طریقۂ اصلاح بھی دیگر اساتذہ سے مختلف تھا۔ وہ صرف لفظوں کے ہیر پھیر سے شعر کو بامحاورہ موزوں یا بامعنی بنانے کو کافی نہیں سمجھتے تھے بلکہ شعر کے داخلی اور خارجی دونوں پہلوؤں پر نظر رکھتے تھے، عموماً غیر مہذب یا رسمی اشعار کو یکسر قلم زد کر دیتے اور اصلاح کے وقت اس بات کا خصوصاً خیال رکھتے تھے کہ ان کی اصلاح شاگرد کی علمی اور ذہنی سطح سے نامطابق نہ ہو۔

اس زمانے میں عموماً اساتذہ مشاعروں میں اپنے شاگردوں کی پوری بٹالین کے ساتھ شریک ہوتے۔ چاہے شاگردوں کو مدعو کیا گیا ہو یا نہیں حضرت سیماب نے یہ تو نہیں کیا البتہ جب ان کے پاس کسی مشاعرے کا دعوت نامہ آتا تو کوشش کرتے کہ منتظمین مشاعرہ ان کے دو چار شاگردوں کو بھی مدعو کریں اور وہ بھی پورے احترام و التزام کے ساتھ اور اس دستور کو بھی غالباً انھی نے رواج دیا، اس طرح شاگردوں کا ادبی تشخص بھی بنتا تھا اور احترام بھی۔ پھر دورانِ مشاعرہ بھی اپنے شاگرد کی کامیابی کے لیے فکرمند اور کوشاں رہتے۔ مثال

itsurdu.blogspot.com

کے طور پر افتخار امام صدیقی صاحب کی تحریر کے ایک اقتباس کے ساتھ اپنی بات ختم کر رہا ہوں۔ وہ اپنے مضمون 'آگرہ اسکول۔ ایک تعارف' (مطبوعہ: شاعر، ہم عصر اردو ادب نمبر۔ مئی تا دسمبر 1997) میں تحریر فرماتے ہیں:

"... وہ ساغر نظامی جو اپنے وقت کے مشاعروں کے کامیاب ترین مترنم شعرا میں سے بھی تھے۔ حفیظ اور ساغر کے ترنم اور مشاعروں میں کامیابی کی کہانیاں اب بھی لوگوں کو معلوم ہیں اور یہ واقعات بھی کہ اگر کسی مشاعرے میں ساغر صاحب سے پہلے حفیظ جالندھری یا کسی اور شاعر نے اپنی غزل کے پہلے مطلع ہی سے چھتیں اڑانا شروع کر دی ہیں تو ساغر صاحب اپنے استادِ محترم کی طرف دیکھتے ہوئے اشارہ کر رہے ہیں کہ میں مشاعرہ نہیں پڑھوں گا۔ غزل کا مطلع دوسرا ہونا چاہیے۔ اور ادھر استادِ محترم نے سگریٹ کی ڈبیہ سے پنی نکالی اس پر ایک اور مطلع لکھا اور اپنے شاگردِ عزیز کی طرف بڑھا دیا۔ ساغر صاحب نے مطلع پر نگاہ کی، چہرہ کھل اٹھا، اپنی باری آنے پر جب ترنم سے نیا مطلع پڑھا تو داد کے ڈونگرے برسے اور آہ و واہ سے پنڈال میں قیامت بپا ہوئی۔"

○

رازِ عروض اور دستور الاصلاح

میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ حضرت سیماب اکبرآبادی نے اردو شاعری کے طالب علموں اور خصوصاً اپنے شاگردوں کی تربیت کے لیے دو کتابیں 'رازِ عروض' اور 'دستور الاصلاح' تحریر فرمائی تھیں، ان دونوں کتابوں کی مقبولیت کا اندازہ یوں لگایا جاسکتا ہے کہ قلیل وقتوں میں ہی ان کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہوئے۔

'رازِ عروض' شاعری کے مبتدیوں کے لیے ایک بیش قیمت تحفہ ہے۔ اس کتاب سے پہلے بھی اساتذہ سخن نے عروض اور فن شاعری پر لاتعداد کتابیں لکھیں لیکن ان میں سے بیشتر یا تو فارسی میں تھیں یا عربی اور فارسی زدہ اردو میں۔ پھر نصاب کے نظریے سے ان کتابوں کو نہیں لکھا جاتا تھا بلکہ استاد اپنی ابتدائی منوانے کے لیے عروض کی کتابیں لکھتے تھے جن میں درجہ بدرجہ شعر کہنے کے مراحل کو ملحوظ رکھنے کے بجائے بحروں اور شعری نکات پر زیادہ توجہ دی جاتی تھی اس لیے ان کتابوں سے اوسط لیاقت کے حامل طالب علم بہت زیادہ فیض حاصل نہیں کر پاتے تھے۔ حضرت سیماب چونکہ ہمیشہ بچوں اور نوجوانوں کی تعلیم و تربیت کے لیے کوشاں رہے اور اردو زبان سے لے کر امور خانہ داری تک کئی نصابی کتابیں تحریر فرمائیں، لہٰذا وہ تعلیمی اور نصابی ضرورتوں سے آگاہ رہے۔ انھیں اندازہ تھا کہ اب تک فن شاعری کو باقاعدہ نصاب کی حیثیت نہیں دی گئی اور اسے تاریخ، جغرافیہ، الجبرا یا سائنس کی طرح ایک تدریسی مضمون کا درجہ نہیں دیا گیا۔ ان کے اسی خیال نے انھیں 'رازِ عروض' تحریر کرنے پر آمادہ کیا۔

'رازِ عروض' میں شعر کہنے کے ابتدائی لوازمات سے لے کر اصطلاحاتِ شاعری کی آسان تفہیم اور مروجہ بحروں کی سلیس زبان میں فہمائش کی گئی ہے، بظاہر یہ ایک چھوٹی سی کتاب ہے جو حضرت سیماب نے بہت مختصر وقت میں تحریر فرما دی لیکن طالب علموں کے

itsurdu.blogspot.com

لیے یہ ایک نادر تحفہ ثابت ہوئی، لطف کی بات یہ ہے کہ خود حضرت سیماب کے بعض حریف استادانِ سخن نے بھی اپنے شاگردوں کو اس کتاب کی روشنی میں تربیت دی۔

'دستور الاصلاح' حضرت سیماب کی ایک بے مثال تصنیف ہے۔ دراصل عہد قدیم سے اساتذہ سخن اپنے تلامذہ کے کلام پر اصلاح فرماتے رہے ہیں اور یہ ہنر سینہ بہ سینہ نسلاً بعد نسل منتقل ہوتا رہا لیکن کبھی کسی نے نہیں سوچا کہ اس ہنر کا کوئی دستور تحریری شکل میں بھی ہونا چاہیے۔ یہاں تک کہ اردو شاعری، مشاعرے، استادی، شاگردی، سب کچھ، عمومی اور بے وقعت ہوتا چلا گیا، حالات اس قدر خراب ہوئے کہ بعض شعرا نے خود کو استاد کہلانے کے شوق میں اصلاحِ سخن کو عمومی اور بازاری بنا دیا، ان کے نزدیک یہ عمل بھی یا تو تفریحِ طبع ہوگیا یا پھر ذریعۂ معاش۔ لیکن کچھ سنجیدہ مزاج اساتذہ اب بھی باقی تھے جو شاعری کے تقدس کی حفاظت کے لیے فکر مند اور کوشاں رہتے تھے، انہی معدودے چند اساتذہ میں حضرت سیماب بھی تھے لیکن ان کی جدت پسند طبیعت انھیں ہمیشہ اکساتی رہتی تھی کہ اس کریہہ ماحول کی اصلاح ضروری ہے۔ شعر مہذب کا یہ داعی چاہتا تھا کہ نئے زمانے کے ساتھ اس عظیم فن کو ہم آہنگ کیا جائے۔ ایک دستور، ایک نصاب مرتب کیا جائے اور اسی فکر اور احساس نے 'دستور الاصلاح' کی شکل اختیار کرلی۔

جب 'دستور الاصلاح' کا پہلا ایڈیشن چھپ کر منظر عام پر آیا (جولائی 1940) تو ادبی دنیا میں ہنگامہ مچ گیا۔ سنجیدہ اور ذمے دار اساتذہ اور شعر و ادب کے باشعور طالب علموں نے اس کتاب کو خوب خوب سراہا اور حضرت سیماب کی علمی حیثیت کافی بلند ہوگئی لیکن بعض روایت پسند، دقیانوسی فکر کے حامل اساتذہ یا وہ جو اپنی اوسط فنی لیاقت کے باوجود استاد کا درجہ حاصل کیے بیٹھے تھے، اپنی قلعی کھل جانے کے خوف سے اس کتاب کے خلاف پروپیگنڈا کرنے لگے۔ اس سے پہلے بھی حضرت سیماب کے خلاف چوطرفہ محاذ کھلے ہوئے تھے ایک اور ادبی معرکے نے جنم لے لیا۔

'دستور الاصلاح' کی ابتدا 'تمہید' سے ہوتی ہے۔ اس باب کی ابتدا میں اس عہد کے شعرا کی تین قسمیں بتائی گئی ہیں، پھر شاعری کے معیار کے زوال کا ذکر ہے اور پھر 'آگرہ

اسکول' کا ذکر ہے کہ 'دستور الاصلاح' آگرہ اسکول ہی کی دین ہے۔

دوسرا باب 'اصلاحِ کلام سے پہلے اصلاحِ نظام' ہے۔ اس دلچسپ باب کے ذیلی عنوانات ہی اس کی اہمیت کی دلالت کرتے ہیں: اصلاحِ زبان، اپنی اصلاح، اصلاحِ خیال ان عنوانات پر نہایت معلوماتی اور فکر انگیز بحث ہے، ایک اقتباس دیکھیں:

"... رائج العوام تغزل ہے کیا؟ نفسانیت کی ایک برہنہ ترجمانی، حسن و ہوس کا ایک موزوں اشتہار، قدیم شعرا کے جذباتِ مرحوم کی جگالی، پرانے زنگ آلود برتنوں پر نئی قلعی، بازاری الفاظ اور زنانہ محاورات کی نمائش، شراب نوشی و شاہد پرستی کی مجرمانہ تبلیغ، قدامت پسندی کا وحشیانہ مظاہرہ یا خلوتِ عیش و طرب کی آپ بیتی کہانی۔ مگر اس سے سننے والوں کو کیا فائدہ پہنچتا ہے؟ ایک فرضی محبوب، فرضی ولفظی محبت، اس کا فرضی ہجر، فرضی رقیب، فرضی اضطراب، فرضی دیوانگی، آخر اس فرضی کتھا کے بار بار دہرانے کا نتیجہ کیا ہے۔

نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ مشاعروں میں راتیں کالی ہوں، گھر پر بیاضیں کالی ہوں اور اس کے علاوہ اعمال کی فردیں کالی ہوں۔ "وقنا ربنا عذاب النار"

اگلے باب 'مجلسی و اجتماعی اصلاح' میں انھوں نے مشاعروں کے جدید نظامِ عمل پر روشنی ڈالی ہے، یہ باب بھی اپنے اندر کئی دلچسپیاں اور معلومات سمیٹے ہوئے ہے۔ یہاں انھوں نے مشاعروں کے بجائے 'مناظموں' کے انعقاد پر زور دیا، بالکل مبتدی شعرا کے مشاعروں میں کلام سنانے کی مخالفت کی، ترنم سے کلام سنانے کو مشاعرے کے زوال کا سبب بتایا، انھوں نے زور دیا کہ صرف تعلیم یافتہ طبقے کو مشاعروں میں دعوتِ سماعت دی جائے ایسے ہی کئی اہم نکات اس باب کا حصہ ہیں۔

'ضرورتِ اصلاح' ایک اہم باب ہے۔ اس میں اصلاحِ سخن کی مختصر تاریخ، اصلاح کی اہمیت اور ضرورت، اصلاح کے عامیانہ رویے اور ایسے ہی کئی امور پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

کتاب میں دو ابواب سب سے زیادہ اہم ہیں پہلا 'اصلاح لینے کا طریقہ' اور دوسرا 'اصلاح دینے کے طریقے جو عرصے سے میرے معمولات اصلاح میں شریک ہیں' اول الذکر باب میں شاگردی کے لیے ضروری گائیڈ لائن یا رہنمائی کی گئی ہے اور کئی باریک

itsurdu.blogspot.com

باریک باتوں کی طرف اشارے کیے گئے ہیں جو ایک طالب علم کے لیے مشعلِ راہ ہیں۔ دوسرے باب میں اصلاح کے اصول لکھے گئے ہیں۔ جو حضرت سیماب کے معمولاتِ اصلاح پر بھی روشنی ڈالتے ہیں اور ان تجربات کی روشنی میں استادانِ فن کی رہنمائی بھی ہو جاتی ہے، بظاہر یہ معیوب سا لگتا ہے کہ آپ کسی استادِ فن کو یہ سکھائیں کہ اصلاح کا طریقہ کیا ہونا چاہیے لیکن ذرا جدید نظامِ تعلیم پر غور کیجیے کہ آج سند یافتہ اور تربیت یافتہ ٹیچرس کے لیے بھی وقتاً فوقتاً ٹریننگ کا اہتمام ضروری سمجھا جاتا ہے اور اگر آپ فن شاعری کو تدریسی مضمون سمجھیں تو کیا مستند اساتذہ کو کسی ٹریننگ کی ضرورت نہیں؟ یہ کام اگر سب سے پہلے حضرت سیماب نے کیا تو یہ ان کا ایک بہت بڑا اجتہادی قدم ہے۔

آگے کے ابواب اس طرح ہیں: 'شعرائے متقدمین کا طریقۂ اصلاح' جس میں تعارفی نوٹ کے بعد میر تقی میر، غلام ہمدانی مصحفی، امام بخش ناسخ، حیدر علی آتش، مومن خاں مومن، اسد اللہ خاں غالب اور امیر لکھنوی جیسے عظیم شعرا کی اصلاحوں کے نمونے اور ان پر خود حضرت سیماب کی توجیہات درج ہیں۔ اس کے بعد 'شعرائے متاخرین کا طریقۂ اصلاح' میں بھی تعارفی نوٹ کے بعد چند اساتذہ کی اصلاحیں اور حضرت سیماب کی توجیہات شامل ہیں ان اساتذہ میں منیر شکوہ آبادی، امیر مینائی، داغ دہلوی، جلال لکھنوی، امیر اللہ تسلیم اور شوق قدوائی شامل ہیں۔ 'شعرائے عہد موجود اور اصلاح کلام' کے ذیل میں ابتدائی نوٹ کے بعد جلیل مانک پوری، بے خود دہلوی، قمر بدایونی، دتاتریہ کیفی، فانی بدایونی، احسن مارہروی، نوح ناروی، وحشت کلکتوی، دل شاہ جہاں پوری، آرزو لکھنوی اور خود حضرت سیماب کی اصلاحوں کے نمونے اور توجیہات سیماب درج ہیں۔ 'موازنۂ اصلاح' کا حصہ بڑا دلچسپ ہے۔ ایک غزل پر جلیل مانک پوری، نوح ناروی اور سیماب اکبرآبادی کی اصلاحیں پیش کی گئی ہیں۔ اگلی غزل پر جگر بسوانی اور سیماب اکبرآبادی کی اصلاحیں ہیں۔ اس حصے کے مطالعے سے اس عہد کے اساتذہ کے طریقۂ اصلاح کا موازنہ کیا جا سکتا ہے۔ ہاں! البتہ یہاں حضرت سیماب نے کسی اصلاح کی توجیہہ نہیں کی۔

'ایک اور معرکہ آرا موازنہ' میں ایک غزل پر اس دور کے متعدد اساتذہ کی اصلاحیں

درج ہیں جن میں آرزو لکھنوی، ریاض لکھنوی، شاد عظیم آبادی، ناطق لکھنوی، سیماب اکبرآبادی، شفق عماد پوری، شوق قدوائی، فانی بدایونی، باقی غازی پوری، دلیر مارہروی، ریاض گورکھپوری، سائل دہلوی، عزیز لکھنوی، بزم اکبرآبادی، دل شاہ جہاں پوری، ریاض خیرآبادی، بے باک شاہ جہاں پوری، اطہر ہاپوڑی، صفی لکھنوی اور وحشت کلکتوی شامل ہیں، یہ موازنہ اتنا زبردست اور دلچسپ ہے کہ سخن فہم قاری حیرت و مسرت کی تصویر ہو جاتا ہے۔

یہاں ایک بات کا ذکر ضروری ہے کہ 'دستور الاصلاح' کا پہلا ایڈیشن جب لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچا تو بہت ہنگامہ ہوا۔ ماضی کے اساتذہ پر حضرت سیماب کی ناقدانہ توجیہات بہت سے روایت پرستوں سے برداشت نہیں ہوئیں پھر معاصر اساتذہ کی اصلاحوں کے موازنے سے کچھ اساتذہ اور ان کے شاگرد برہم ہو گئے۔ حضرت سیماب کے خلاف ملک بھر کے اخبارات و رسائل میں مضامین شائع ہوئے جن میں فنی بحث کم اور شخصی مخاصمت زیادہ تھی، اس کا اثر یہ ہوا کہ حضرت سیماب کے شاگردوں کی تعداد میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا، ان کی مقبولیت اور بڑھ گئی۔ 'دستور الاصلاح' کے دوسرے ایڈیشن (جولائی 1944) کے پیش لفظ سے حضرت سیماب کا ایک اقتباس دیکھیں:

> "جہاں 'دستور الاصلاح' نے شعرا وطن کے لیے ایک دستور پیش کر کے داد و تحسین حاصل کی وہاں اکثر قدیم الخیال حضرات اساتذہ کی اصلاحوں کی توجیہہ سے چیں بہ جبیں بھی ہوئے۔ یہ خوش فہم اساتذہ کو فرشتہ سمجھتے ہیں جن سے سہو نظر کا اندیشہ ہی نہیں ہو سکتا اور اپنے غم و غصہ کی تائید میں 'خطائے بزرگان گرفتن خطاست' کہہ کر محو نازش ہیں کہ گویا ہم نے بڑا تیر مارا۔ جو لوگ خطا اور غلطی میں فرق نہیں سمجھتے وہ کسی فنی یا علمی کتاب پر تنقید و تبصرہ کی زحمت ہی خدا جانے کیوں اٹھاتے ہیں۔"

'دستور الاصلاح' کے دوسرے ایڈیشن کے آخر میں کتاب کے تعلق سے حضرت فانی بدایونی، حضرت وحشت کلکتوی، حضرت حکیم آزاد انصاری، مولانا قمر بدایونی، حضرت دتاتریہ کیفی اور حضرت درد کاکوروی کی آرا شامل ہیں۔

○

itsurdu.blogspot.com

آگرہ اسکول

آگرہ جسے پہلے اکبرآباد کہا جاتا تھا، شروع ہی سے بڑا شاعر خیز علاقہ رہا ہے، شاہ
جہاں کے عہد میں یہ علوم وفنون کا اہم مرکز ہوگیا۔ شاہ نجم الدین مبارک آبرو عہد اورنگ
زیب میں اکبرآباد میں پیدا ہوئے اور جوانی میں دہلی کا رخ کیا۔ اس وقت دہلی میں دکنی
شاعری سے متاثر ماحول پنپنے لگا تھا اور ولی نے اپنی زبردست چھاپ چھوڑی تھی۔ سراج
الدین خاں آرزو بھی اکبرآباد میں پیدا ہوئے اور عہد محمد شاہی میں دہلی آئے۔ انھوں نے
دہلی میں اردو شاعری کی ترویج اور اپنے طرز کے فروغ کے لیے 'مراختہ' قائم کیا۔ 'مراختہ'
دراصل ریختہ گوشعرا کی مجلس تھی۔ آرزو نے دکنی مزاج شاعری اور اس وقت کی نہایت عمومی
شاعری کی مخالفت کی اور اپنی ایک نئی روش قائم کی اور دہلی کے بیشتر ریختہ گوشعرا بشمول
آبرو، آرزو کے شاگرد ہوگئے۔ فارسی شاعری کے مقابلے میں اسے اردو شاعری کی اولین
تحریک بھی کہا جاسکتا ہے۔ خان آرزو کے سلسلہ تلمذ میں کئی نام روشن ہوئے مثلاً میر تقی میر
یک رنگ، فیک چند بہار، مضمون اور مخلص وغیرہ۔ آرزو نے اس دور کے نئے شعرا کو نہ
صرف تربیت دی بلکہ اردو زبان کے ابتدائی نقوش کو واضح شکل دینے کے لیے لغت کی
تدوین بھی کی۔ مرزا مظہر جان جاناں اکبرآبادی نے بھی اردو میں سب سے پہلے تجدید یا
اصلاح کی بنیاد ڈالی۔

حضرت سیماب اکبرآبادی نے قصرالادب کی بنیاد رکھنے کے ساتھ ساتھ 'آگرہ اسکول'
کی اصطلاح دے کر اردو کے شعرا، ادبا اور قارئین کو چونکا دیا۔ دراصل انھوں نے خاں آرزو
کے 'مراختہ' کو آگرہ اسکول کی بناء ثابت کیا۔ یہ عجیب بات ہے کہ آرزو اور آبرو کے بعد میر
غالب، نظیر اور سیماب بھی آگرہ میں پیدا ہوئے۔ جب حضرت سیماب نے 'آگرہ اسکول'
تصور دیا تو لوگ یہی سمجھے کہ اس سے مراد آگرہ میں پیدا ہونے والے نامور شعرا ہیں لیکن

رفتہ رفتہ انھوں نے اپنی تحریروں اور خطبات کے ذریعے ثابت کرنے کی کوشش کی کہ 'آگرہ
اسکول' سے مراد کوئی فرد یا خود تلامذۂ سیماب کی جماعت نہیں ہے۔ اس کی مزید وضاحت و
تشریح کے لیے رسالہ 'شاعر' نے ستمبر 1937 میں 'آگرہ اسکول نمبر' شائع کیا۔

اردو شاعری کے دو اسکولوں یعنی دہلی اور لکھنؤ پر ہی عموماً گفتگو ہوتی رہی تھی لیکن
حضرت سیماب نے آگرہ اسکول کی اصطلاح استعمال کی۔ انھوں نے اپنے دسویں خطبۂ
صدارت (دسمبر 1935) میں اسکول کی وضاحت ان الفاظ میں کی:

> "آگرہ، لکھنؤ اور دہلی کے بین بین خاموش ترقی کرتا رہا ہے۔ شعرائے متقدمین
> کو چھوڑ کر عہد متوسط کے شعرا نے مرزا غالب مرحوم سے ان کی زندگی تک افادہ کیا
> لیکن آخر آخر یہ خارجی اثر آگرے سے کم ہوتا گیا اور طالبانِ فن کسی مقامی ماہرِ فن کے
> علاوہ دوسروں کے ممنونِ فن نہیں ہوئے۔
>
> وہ سرزمین جس کی خاکِ پاک سے میر و غالب کے سراپا شعر مجسم بنے تھے
> ناممکن تھا کہ دورِ تعلیم و اصلاح میں میر و غالب کی صدائے بازگشت سے نہ گونجتی، گونجی
> اور پوری قوت کے ساتھ گونجی 1912 سے علوم وفنون کی ترقی کے ساتھ ساتھ مرزا
> غالب کا رنگِ تغزل یکا یک ہندوستان میں چمک اٹھا تعلیم یافتہ اور ترقی مآب طبقوں
> میں دہلی و لکھنؤ کے تصنع و تکلف کی زیادہ قدر نہ رہی۔ کچھ افرادِ ملک میں ایسے پیدا
> ہوگئے جو ان دونوں اسکولوں سے الگ ایک جدید رنگ کے علم بردار ہوئے۔ یہ وہ
> رنگ تھا جو مرزا داغ اور مرزا غالب کے رنگِ تغزل کے امتزاج سے بقدرِ معتدل پیدا
> ہوا تھا۔ آگرہ اسکول بھی آج اسی رنگ کا متبع و موید ہے اور یہی وہ اسلوب و روش ہے
> جسے ہم اردو شاعری کے لیے بطورِ معیار پیش کرسکتے ہیں۔"

یہاں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ آگرہ اسکول اولاً میر و غالب اور پھر غالب و داغ
کے رنگِ سخن کے امتزاج سے پیدا ہونے والے شعری رویوں کا نام ہے لیکن شاید یہ ایک
ابتدائی فکر تھی، رفتہ رفتہ اس میں مزید وسعتیں تلاش کی گئیں۔ حضرت سیماب نے شعرائے
اکبرآباد آرزو، آبرو، مظہر، نظیر، میر، غالب اور ان سبھی کے تلامذہ کا بغور مطالعہ کیا ہوگا اور یہ
جائزہ بھی لیا ہوگا کہ ان شعرا کی وہ کیا خصوصیات ہیں جو دہلی اسکول اور لکھنؤ اسکول کے دیگر
شعرا کے یہاں نہیں ملتی ہیں۔ ان شعرا کی زبان کی اپنی الگ کیا خصوصیات ہیں، متروکات

itsurdu.blogspot.com

اور عروضی ترجیحات کیا ہیں۔ طریقۂ اصلاح کیا رہا ہے۔ معاشرتی اور سماجی نظریات کیا رہے۔ یہ کام اتنا آسان بھی نہیں تھا کہ علم سماجیات، تاریخ، زبان و بیان، علم عروض اور لسانیات کا ماہر ہی ایسے مطالعے اور اس کے نتائج کا احاطہ کر سکتا ہے۔ پھر جس اعتماد کے ساتھ تن تنہا حضرت سیماب نے 'آگرہ اسکول' کے وجود کا اعلان کیا اور مدلل بحثیں کیں یہ کوئی معمولی کام نہیں تھا۔ ان کے معاصر اور بعد کے ناقدان ادب اور مورخین ادب نے ان کے اس خیال پر چاہے کان نہ دھرے ہوں لیکن ان کے اس جرأت مندانہ تصور سے انکار ممکن نہیں ہے۔

بات صرف اتنی نہیں ہے کہ اپنے مطالعے اور تجزیے کے نتیجے میں حضرت سیماب نے چند اصول وضوابط طے کیے اور ان اصول وضوابط کے فریم میں ٹھیک بیٹھنے والے شعرا یا اپنے تلامذہ کو ایک مالا میں پرو کر آگرہ اسکول کا نام دے دیا۔ 'دستور الاصلاح' میں آگرہ اسکول کے تعلق سے ان کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

> ''آگرہ اسکول فی نفسہٖ کوئی ادارۂ خیال نہ تھا۔ اسی متعینہ اصلاحی نے اس کا وجود متعین اور مسلم کر دیا۔ آگرہ یا اکبرآباد، دہلی اور لکھنؤ کے مابین ایک قدیم اسلامی دارالسلطنت ہے جہاں بابر، ہمایوں، اکبر اعظم اور شاہ جہاں نے برسوں حکومت کی اور دنیا بھر کے ممتاز ارباب کمال کو وہاں جمع ہونے کی دعوت دی۔ انتقال دارالحکومت کے بعد اکبرآباد کے مشہور علما اور شعرا دہلی اور لکھنؤ چلے گئے اور جس چیز نے یہاں نشو ونما پائی تھی اسے دہلی اور لکھنؤ میں عروج ملا۔
>
> مرزا اسد اللہ خاں غالب آگرہ ہی میں پیدا ہوئے، یہیں پروان چڑھے، یہیں تعلیم وتربیت پائی اور یہیں سے دہلی گئے۔
>
> میر تقی میر بھی آگرہ ہی میں پیدا ہوئے، یہیں تعلیم پائی، یہیں شعر کہنا سیکھا اور سن بلوغ کے بعد یہیں سے دہلی اور پھر دہلی سے لکھنؤ پہنچے۔
>
> دہلی اور لکھنؤ میں مرکزیت قائم ہونے کے بعد اکبرآباد (آگرہ) کی حیثیت ایک ثالث کی سی رہی۔ وہ دیکھتا رہا کہ دہلی اور لکھنؤ میں لسانی اور علمی تحقیق کا زاویہ نگاہ کیا ہے؟ کبھی تو اس نے اس فیصلے کو تسلیم کر لیا جس پر دہلی اور لکھنؤ کا اتفاق تھا کبھی دونوں کے اختلاف سے فائدہ اٹھا کر 'خذ ما صفا ودع ما کدر' پر عامل ہو گیا، اور کبھی بحیثیت ثالث خود اپنا نظریہ پیش کر کے اس پر قائم رہا۔ اس طرح آگرہ کی زبان کو دہلی اور لکھنؤ کی زبان کا عطر یا نچوڑ کہنا چاہیے اور آگرہ کی شاعری کو لکھنؤ اور دہلی کی شاعری کا

> تجزیۂ بکتر، اس کا ثبوت اکبرآباد کے قدیم مشاہیر شعرا کا کلام ہے جس میں زبان و محاورات، اسلوب بیان، غرض کہ ہر انداز متوسط اور متعدل پایا جاتا ہے ... آگرہ اسکول اسی لسانی و ذہنی اعتدال کی تعلیم وتبلیغ کا ایک ادارہ ہے اور خدا کا شکر ہے کہ وہ بھی آج دہلی اور لکھنؤ کی طرح مشہور اور ان دونوں اسکولوں سے زیادہ مقبول ہے۔''

آگرہ اسکول کی مقبولیت کا دعویٰ حضرت سیماب نے اپنے تلامذہ کی تیزی سے بڑھتی ہوئی تعداد کی وجہ سے کیا ہوگا لیکن سچ تو یہ ہے کہ غالب کے بعد سرزمین آگرہ سے صرف حضرت سیماب ہی کو شہرتِ دوام حاصل ہوئی اور ان دونوں کے درمیان کے عہد کے اکبرآبادی شعرا کا آج کہیں ذکر بھی نہیں ہوتا۔ شاید اسی لیے ادب نگاروں نے آگرہ اسکول کا مطلب دبستانِ سیماب سمجھ لیا اور اس ادارۂ فکر پر زیادہ کچھ کام نہ ہو سکا۔

اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ آگرہ اسکول دبستانِ سیماب کا ہی ایک روپ ہے پھر بھی اس اسکول کے جو خط و خال آگے ابھر کر آئے وہ اتنے وقیع ہیں کہ دہلی اور لکھنؤ اسکول کے بعد رام پور، عظیم آباد، دکن اور لاہور اسکولوں کی طرح آگرہ اسکول کو تسلیم نہ کیے جانے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہمارے ناقدانِ ادب نے تو کسی بڑے نام یا اس کے کام سے متاثر ہو کر ادارۂ خیال یا اسکول کا عام طور پر دعویٰ کیا، یہ ایک الگ بحث ہے جس کی یہاں گنجائش نہیں۔ حضرت سیماب نے جس آگرہ اسکول کا تصور دیا وہ عہد بہ عہد رونما ہونے والے ادبی اور فکری تغیرات سے عالم وجود میں نہیں آیا یا پھر اسے محسوس ہی نہیں کیا گیا بلکہ خود انھیں اس کی باقاعدہ تشکیل کرنی پڑی۔ انھوں نے کئی نکات، اصول وضوابط اور نظریات قائم کیے جن پر آگرہ اسکول کی اساس ہے اور جو ماضی کے شعرائے اکبرآباد کے افکار و اطوار کی روشنی ہی میں مرتب کیے گئے لیکن ان میں عصری مزاج ماحول اور ضرورتوں کو ملحوظ رکھا گیا۔ اس طرح ایک جدید نظام بنانے کی شعوری کوشش کی گئی۔ اس ضمن میں 'شاعر' کے 'آگرہ اسکول نمبر' میں اعجاز صدیقی مرحوم کے مضمون 'تعارف' کا ایک اقتباس بطور وضاحت پیش ہے:

> ''آگرہ اسکول کے پیروکاروں کی حیات پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آگرہ اسکول کوئی فرقہ بند جماعت نہیں بلکہ ہر خیال ہر اعتقاد، ہر مذہب اور ہر رنگ کی مختلف اہل علم ہستیوں کا ایک گروہ ہے جو بعض ضروری اور تعمیری خیالات کے ساتھ

itsurdu.blogspot.com

ایک مرکز اور پلیٹ فارم پر جمع ہوگیا ہے۔ اس جماعت کی ملک کو ضرورت تھی۔ اگر یہ عالی خیال جماعت معرض ترتیب میں نہ آتی تو تدبیر منزل اور نفسیات شناسی کا پیام ملک کی لامحدود وسعتوں تک پہنچانا مشکل ہوجاتا۔ بے شک اس کا نام 'جدید اسکول' بہت موزوں تھا لیکن دو سبب ہیں جن کے ماتحت اس کا نام آگرہ اسکول ہوگیا۔ ایک تو یہ کہ لفظ جدید کوئی خاص علمی ادبی مفہوم پیدا نہیں کرتا۔ دوسرے یہ کہ اس کی اساس اس ہستی کی مرہون منت ہے جس نے سرزمین آگرہ سے نمود پائی ہے۔ تیسرا سبب یہ ہے کہ ادب اردو کے اسکول ہمیشہ مقامیت کے ساتھ معنون کیے جاتے رہے ہیں مثلاً دہلی اسکول، لکھنؤ اسکول، آگرہ ان دونوں کے بین بین تھا اس لیے جب یہاں جدید خیالات، نئے اسالیب، نئے رجحانات اور جدید موضوعات کی تخلیق ہوئی تو ان تمام نئے افکار کی مرکزیت کا نام آگرہ اسکول رکھا گیا۔"

اس اقتباس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ کہنہ اور فرسودہ ادبی مزاج و ماحول سے منحرف ہو کر جدید اذہان کی تشکیل آگرہ اسکول کا بنیادی نظریہ ہے۔ ضروری اور تعمیری خیالات، تدبیر منزل اور نفسیات شناسی پر بھی زور دیا گیا ہے۔ اسی مضمون سے مزید باتوں کا اندازہ ہوتا ہے مثلاً بیسویں صدی میں دنیا کی ترقی اور روشن خیالی سے متاثر ہو کر اس اسکول نے علم و ادب میں نئی زندگی کا پیغام دیا، کئی امور پر خصوصی توجہ کی گئی جیسے ان تمام قدیم الایام پابندیوں سے انحراف جن میں شعرا اور ادبا گھرے ہوئے تھے۔ جدید زمانے کی ضروریات، دوسری قوموں اور دوسری زبانوں کی ترقی کے لیے علم پر زور دیا گیا۔

اردو کے قدیم رجحانات اور رویوں سے انحراف بظاہر کوئی نئی چیز نہیں تھی کہ حضرت سیماب سے قبل حضرت حالی، حضرت محمد حسین آزاد اور حضرت اقبال نے اس جانب توجہ فرمائی تھی لیکن ان میں اور حضرت سیماب یا آگرہ اسکول کے نظریات میں بہت فرق تھا۔ ان اکابرین نے مغربیت کی تیز آندھیوں سے متاثر ہو کر ادبی منظر نامے میں تبدیلیوں، نیز مغربی اذہان و افکار کو قبول کرتے ہوئے جدید مکتب خیال کی تشکیل کی کوشش کی جب کہ آگرہ اسکول نے ان متاثر کن مغربی اذہان و افکار کے چند محاسن کو پسند ضرور کیا لیکن ان سے متاثر ہونے کے بجائے مشرقی علوم اور اذہان و افکار کی دلالت کی اور ہندوستانی اخلاقیات پر خاصہ زور دیا۔ آگرہ اسکول کے نظریات میں وطن پرستی کے ساتھ ترقی کو اہمیت

دی گئی اور مغربی ادب کے مقابلے میں ہندوستانی ادب اور خصوصاً اردو ادب کو لا کھڑا کرنے کے خواب دیکھے گئے۔

آگرہ اسکول کی چند دیگر خصوصیات اور امتیازات بھی ہیں جو بہت زیادہ تفصیل کے متقاضی ہیں لیکن یہاں بالاختصار ان کا صرف ذکر کر سکوں گا۔ آگرہ اسکول نے صرف شاعری پر ہی انحصار نہیں کیا بلکہ افسانہ، ڈراما، ناول، انشائیہ، تنقید، تحقیق، غرض سبھی اصناف ادب کا احاطہ کرنے کی کوشش کی۔ غزل کے مقابلے میں نظم کو زیادہ اہمیت دی اور ہیئت کے تجربوں کو ضروری قرار دیا۔ غزل کے اخلاق سوز اور فرسودہ موضوعات پر کراہیت اور بے زاری کا اظہار کیا۔ عروض کی غیر ضروری پابندیوں کی مخالفت کی۔ مشاعروں اور ادبی محفلوں کو تفریح گاہ کے بجائے تربیت گاہ بنانے پر زور دیا۔ فن شاعری کو عربی اور فارسی کے اصول وضوابط سے آزاد کر کے ہندوستانی ماحول و مزاج کے مطابق نئے سرے سے مرتب کر کے اسے خالص اردو عروض بنانے کی جانب توجہ دلائی۔ سبھی مذاہب کو اہمیت دی گئی اور مذاہب اور روحانیت کو صالح اخلاقیات کے لیے ضروری قرار دیا۔ زبان میں نئی تراکیب اور اختراعات پیش کیں اور متروکات کی بھی ایک فہرست جاری کی۔ دیگر علوم مثلاً نفسیات، فلسفہ، منطق اور تاریخ کو اصناف ادب اور خصوصاً شاعری میں جگہ دی اور تخلیق ادب میں موجودہ سیاسی و سماجی حالات و واقعات کو بھی اظہار ذات کے ساتھ ضروری گردانا اور مطالعے کو تخلیق سے زیادہ اہمیت دی۔

ان نظریات کی تفہیم و توسیع کے لیے قصر الادب کے رسائل و اخبارات میں کئی مضامین شائع ہوئے اور حضرت سیماب نے آگرہ اسکول سے وابستہ افراد کی رہنمائی کے لیے کئی کتابیں لکھیں بلکہ اپنے ادبی کاموں اور شاعری کو مکمل طور پر آگرہ اسکول کے امتیازات اور افکار کی روشنی میں ڈھالا۔ یہ اردو کے کسی اور ادارۂ فکر میں نہیں ہوا کہ کوئی ادیب یا شاعر کسی ادارۂ فکر یا اسکول کا آئینہ ہو۔ حضرت سیماب نے اس کی اولین نظیر پیش کی اور خوب کی۔

اس دور میں ترقی پسند نظریات اپنے پر پرزے نکال چکے تھے، مارکسی خیالات ادیبوں اور

itsurdu.blogspot.com

شاعروں کو متوجہ اور متاثر کرنے لگے تھے پھر روس کی کمیونسٹ حکومت نے بھی اپنے منشور کے ذیل میں آنے والے ادب کی سرپرستی کی ابتدا کر دی تھی۔ آزادی ہند سے چند برس قبل اور بعد میں اشتراکیت اور مغربی افکار دونوں کی یلغار نے دیگر زبانوں کی طرح اردو کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ بھلا ایسے حالات میں خالص مشرقی آوازوں پر کون کان دھرتا؟ ایسے دور کے اشتراکی یا مغرب زدہ نقادوں نے حضرت سیماب کو تو خیر ایک استادِ فن اور اہم شاعر کی حیثیت سے کسی حد تک قبول کر لیا لیکن 'آگرہ اسکول' پر خاموشی اختیار کر لی۔ حضرت سیماب کے بہت سے تلامذہ بھی یا تو اس تیز رو میں بہہ نکلے یا پھر اس کے اثرات میں گم ہو گئے۔ آج آگرہ اسکول کا ذکر صرف ذکر ہی ہے اس سے زیادہ کچھ نہیں لیکن ترقی پسند، جدید اور مابعد جدید ادب کے بعد کے ادب پر نظر ڈالیے تو آپ کو آگرہ اسکول کے نظریات نمایاں نظر آئیں گے خصوصاً شاعری میں، مشرقی روحانیت کی گونج آپ کو صاف سنائی دے گی۔ میر، غالب اور داغ کے لب و لہجے کا امتزاج بہت سے شعرا میں نظر آئے گا۔ آگرہ اسکول اصطلاحاً آج موجود نہیں ہے لیکن عصری ادب میں اب بھی پوری آب و تاب سے گونج رہا ہے۔

○

آخری سفر اور وفات

1944 میں قرآنِ پاک کا منظوم ترجمہ مکمل کرنے کے بعد حضرت سیماب اکبرآبادی کی زندگی میں کافی تبدیلیاں آ گئی تھیں۔ اب انھوں نے بحث و مباحثہ اور ادبی معرکوں کے بجائے تصنیف و تالیف اور اپنی کتابوں کی اشاعت پر توجہ کی۔ انھیں بڑھتی ہوئی عمر اور خرابی صحت کا پورا احساس تھا۔ تلامذہ کی اتنی بڑی تعداد کے کلام پر اصلاح میں کافی وقت لگتا تھا۔ غالباً انھیں یہ احساس ہو گیا تھا کہ زندگی بہت کم ہے اور کام بہت زیادہ، لہٰذا انھوں نے ماہنامہ شاعر (اپریل 1945ء) میں 'تفویض' کے عنوان سے اعلان فرما دیا کہ:

> "اب میں اپنی کہولت، اعصابی اور فطری اضمحلال سے معذور ہو کر مجبور ہوں کہ اصلاحِ کلام سے دست کش ہو جاؤں ... اس لیے اس اعلان کے بعد میرے وہ اساتذہ جو محتاجِ اصلاح ہیں، میرے پاس اپنا کلام اصلاح کے لیے نہ بھیجیں، بلکہ میرے ان تلامذہ کے پاس بھیجیں جو فارغ الاصلاح ہیں۔"

اسی شمارے میں انھوں نے اپنے 93 ایسے شاگردوں کے نام اور پتے بھی شائع کروا دیے جو فارغ الاصلاح تھے، لیکن حضرت سیماب خود اس پابندی پر قائم رہے اور نہ ہی ان کے کچھ مخصوص تلامذہ، اصلاحِ سخن کی خدمت تو ان کے ذمہ آخری سانس تک رہی۔

ملک کے سیاسی حالات عجیب شکل اختیار کر چکے تھے۔ ہندو اور مسلمان دونوں ہی تذبذب میں تھے کہ کانگریس اور مسلم لیگ کی رسہ کشی کا انجام کیا ہوگا، حکومت برطانیہ یہ اعلان کر چکی تھی کہ جلد ہی ہندوستان کو آزادی دے دی جائے گی۔ اس انتشار اور تمام ملک میں پھیلے ہوئے فرقہ وارانہ ماحول کا اثر ایک حساس شاعر اور زبردست تخلیقی قوتوں کے حامل فنکار کے دل و دماغ پر ہونا فطری تھا، حضرت سیماب خود کبھی عملی سیاست میں شامل نہیں ہوئے لیکن اپنی لاتعداد نظموں، قطعات اور رباعیوں کے ذریعے تحریکِ آزادی میں پُراثر طور

itsurdu.blogspot.com

پر معاون رہے تھے، ملک کی تقسیم ان کے لیے بھی کروڑوں ہندوستانیوں کی طرح بے حد تکلیف دہ تھی، اس کرب کا احساس ان کی اس دور کی شاعری میں حرف حرف موجود ہے۔ اس دوران ان کی نظموں کے مجموعے 'شعر انقلاب' سیاسی رباعیوں کے مجموعے 'عالم آشوب' اور مجموعہ غزلیات 'سدرۃ المنتہیٰ' نے علمی اور ادبی حلقوں میں کافی دھوم مچائی تھی۔ ان کی انقلابی نظموں کو آزادی کے متوالے اپنے جلسوں میں گاتے تھے۔ پھر وہ دن بھی آیا جب آزادی کی خوشبو پورے ملک میں پھیل گئی۔ حضرت سیماب نے بھی تمام ہندوستانیوں کی طرح اس دن کا جشن منایا لیکن اپنے انداز میں یعنی ایک ہی دن میں کئی نظمیں لکھیں جو اگلے چند دنوں میں ملک کے اہم روزناموں میں اہتمام سے شائع ہوئیں۔ یہاں اس بات کا ذکر بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ تقسیم ہند کے سبب سرکاری رسالہ 'آج کل' (اردو) کے مدیر کی اسامی خالی ہوگئی تھی، حضرت سیماب نے اس کے لیے اپنی خدمات کی پیش کش کی تھی لیکن اس وقت کے وزیر اعظم آنجہانی پنڈت جواہر لال نہرو سے مراسم کے سبب یہ کام حضرت جوش ملیح آبادی کے سپرد کر دیا گیا تھا۔

1948 میں انھوں نے حضرت خوشتر گرامی مدیر 'بیسویں صدی' دہلی کی فرمائش پر مہاتما گاندھی، پنڈت نہرو، ولبھ بھائی پٹیل اور ابوالکلام آزاد پر طویل شخصی مضامین بھی لکھے تھے، پتہ نہیں خوشتر صاحب نے انھیں کہاں شائع کیا تھا۔

پہلے یوم آزادی (15 اگست 1948) کے جشن پر دہلی کے پکاڈلی کوئینز وے کے شاندار ہال میں ایک قومی مشاعرے کا اہتمام کیا گیا تھا جس میں ملک کے تقریباً سبھی اہم شعرا نے شرکت کی۔ اس مشاعرے کی صدارت ڈاکٹر تارا چند صاحب نے فرمائی تھی۔ حضرت سیماب اس مشاعرے میں شرکت کے لیے 13 اگست کو آگرہ سے روانہ ہوئے۔ وہ خود اور نہ کوئی اور یہ جانتا تھا کہ وہ اپنی پیاری 'ارض تاج' سے آخری بار رخصت ہو رہے ہیں۔ مذکورہ مشاعرے میں انھوں نے اپنی مشہور نظم 'وطن آزاد ہوا' سنائی تھی۔

دراصل حضرت سیماب 'وحی منظوم' کی اشاعت کے لیے کافی فکرمند تھے۔ ان دنوں 'تاج کمپنی' (پاکستان) مذہبی کتابوں کی اشاعت کے لیے بہت مشہور ادارہ تھا۔ وہ اس

ادارے سے خط و کتابت بھی کر رہے تھے، 'وحی منظوم' کا مسودہ وہ اپنے ساتھ دہلی لے آئے تھے، لہٰذا تاج کمپنی کے مالکان سے روبہ رو گفتگو کی غرض سے وہ دہلی سے براہ راست لاہور کے لیے روانہ ہوگئے۔ ارادہ تھا کہ ناشرین سے معاہدہ کرنے کے بعد ہفتے عشرے میں وہ واپس لوٹ آئیں گے۔ 16 اگست کو وہ لاہور پہنچے تو انھیں پتہ چلا کہ تاج کمپنی کی شاخ تو لاہور ہی میں ہے لیکن صدر دفتر کراچی میں ہے، لہٰذا وہ کراچی چلے گئے۔ وہاں ان کے کم از کم چالیس شاگرد موجود تھے جن میں سے چند مقامی تھے لیکن بیشتر مہاجر، سب نے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور کوشش کی کہ حضرت سیماب وہیں کے ہو رہیں۔ انھوں نے ضیا فتح آبادی کو لکھا:

> "... جس کام کے لیے یہاں آیا ہوں وہ کام اب تک نہیں ہوا اور اسی کی تگ و دو میں لگا ہوا ہوں۔ لاہور میں تاج کمپنی کی صرف برانچ ہے۔ مرکزی دفتر کراچی میں ہے اس لیے لاہور سے یہاں چلا آیا ہوں اور تاج کمپنی والوں سے برابر قرآن مجید کے ترجمہ کے متعلق گفتگو کر رہا ہوں۔ چونکہ کام اہم اور بڑا ہے اس لیے وہ ہنوز کوئی فیصلہ نہیں کر سکے۔ جب ملتا ہوں دو چار روز کے لیے ٹال دیتے ہیں اور میں نے سوچا ہے کہ ترجمہ کا آخری فیصلہ کر کے جاؤں گا۔ آخر کب تک انتظار ہی انتظار میں اتنی قیمتی چیز کو معرض التوا میں پڑا رہنے دوں۔"

یہ خط 'سیماب بنام ضیا' میں شائع کیا گیا ہے لیکن تاریخ مکتوب درج نہیں ہے۔ یہ خط اہم اس لیے بھی ہے کہ حضرت سیماب کے کراچی جانے کے پیچھے ہندوستان میں جو سازشیں ہوئیں ان کا اندازہ اسی خط سے ہو سکتا ہے۔ وہ آگے لکھتے ہیں:

> "آگرہ سے جو خطوط آپ نے لکھے ہیں ان سے معلوم ہوا کہ میری عدم موجودگی سے مخالفین کو مخالفت اور غلط پروپیگنڈے کا کافی موقع مل گیا ہے مگر مجھے اس سے قطعاً ہراس نہیں۔ اس لیے کہ جو باتیں آپ نے لکھیں ہیں وہ سرتا پا غلط ہیں۔ سب سے پہلی اور بنیادی غلطی تو یہی ہے کہ میں ہندوستان میں مسلم لیگ کا حامی تھا۔ اگر مخالفین اپنی پوری قوتیں صرف کر دیں تو بھی ثابت نہ کر سکیں گے کہ میں لیگ کا ۱۰۰ کا بھی ممبر بھی ہوا تھا۔ لیگ کی موافقت میں کوئی نظم میں نے آج تک نہیں لکھی۔ 'کار امروز' اور 'ساز و آہنگ' میں مہاتما گاندھی اور کانگریس پر متعدد نظمیں ہیں اور لیگ پر ایک بھی نہیں ہے۔ ... میں نے کوئی ایسی نظم بھی نہیں کہی جو حکومت ہند کے خلاف اشارتاً یا کنایتاً بھی ثابت کی جا سکے۔ آپ جانتے ہیں مجھے سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں۔ میری

itsurdu.blogspot.com

تمام عمر ادبی خدمات میں کٹی ہے تو پھر اب سیاست میں کیا حصہ لوں گا۔ میں نے لاہور میں قائد اعظم کی وفات پر البتہ چند نظمیں کہی ہیں جن میں کوئی طنز حکومت ہند کے متعلق نہیں ہے، اگر میں اس وقت ہندوستان میں ہوتا تو بھی یہ نظمیں ضرور کہتا۔ میرا ضمیر آزاد ہے۔ کانگریس اور لیگ کی پابندیوں سے ہمیشہ آزاد رہا ہوں۔ فرقہ وارانہ ذہنیت کبھی نہیں رہی اور ان تمام حقیقتوں کو کوئی جھٹلا بھی نہیں سکتا۔ مجھے تو ترک وطن کا احساس تک نہیں ہے، اس یقین کے ساتھ کہ جب چاہوں گا ہندوستان چلا جاؤں گا۔ ہندوستان میں سات پیڑھیاں گزری ہیں۔ وہاں کے در و دیوار سے محبت ہے۔ گو میں وطنیت کا قائل نہیں مگر جہاں انسان ستر برس تک رہے وہاں کے ماحول سے محبت ہو ہی جاتی ہے اس لیے مجھے بھی اپنے وطن سے محبت ہے۔ آپ کو تو خود خیال کرنا چاہیے کہ کیا اب میری عمر اس قابل ہے کہ میں حکومت میں کوئی سیاسی درجہ حاصل کر سکوں گا؟ جس کام کے لیے آیا ہوں وہ کام آج ہو جائے تو کل ہی یہاں سے روانگی کا انتظام کروں۔ یہاں کی آب و ہوا اور ماحول مجھے پسند نہیں ہے۔"

اس خط میں ان کا جذبۂ حب الوطنی اس قدر واضح ہے کہ مزید کسی وضاحت کی ضرورت باقی نہیں رہتی البتہ ان کے مخالفین نے انھیں بدنام کرنے کے لیے تمام حربے استعمال کر لیے۔ حضرت سیماب کے قیام کراچی کی کچھ اور وجوہ بھی تھیں۔ ضیا صاحب کو انھوں نے 3 مئی 1949 کو جو خط لکھا (مطبوعہ سیماب بنام ضیا) اس میں کچھ اشارے ملتے ہیں، لکھتے ہیں:

"... اثنائے قیام لاہور میں یکایک اطلاع ملی کہ مظہر حسین سلمہ (چھوٹے فرزند) مع اپنی والدہ، اپنی بیوی اور بھانجی کے براہ بمبئی کراچی پہنچ رہے ہیں۔ یہ اطلاع میرے لیے پریشان کن تھی اور میں آگرہ جانے کے بجائے کراچی آنے پر مجبور تھا۔

مظہر حسین مجھ سے پہلے کراچی پہنچ گئے اور مجھے کئی تار دیے کہ میں فوراً کراچی پہنچوں۔ پہنچا..."

ایک قدآور ادبی شخصیت کی کراچی میں موجودگی اہل علم و ادب کے لیے تو باعث مسرت تھی ہی، حکومت پاکستان نے بھی انھیں نوازنے کے لیے فوراً کراچی میں ایک مکان اور ایک دوکان الاٹ کر دی۔ مظہر مرحوم نے دوکان میں کتابوں کا کاروبار شروع کر دیا۔ حضرت سیماب کو ادبی کاموں کے لیے تمام عمر مقام یا گھر یا دفتر کی کبھی کوئی تعیین نہیں رہی۔

آگرہ میں ہوں یا چاہے کسی شہر میں، وہ اپنا کام برابر کرتے رہے، اس عادت نے کراچی میں بھی ان کا پیچھا نہیں چھوڑا، وہاں انھوں نے اپنی سرپرستی اور مظہر مرحوم کی ادارت میں ایک ادبی رسالہ 'پرچم' جاری کیا (یکم جنوری 1949) 'پرچم' میں ان کا کالم 'علیہ ما علیہ' بہت مقبول ہوا۔ یہ کالم حضرت نیاز فتح پوری کے ان اعتراضات کے جواب پر مشتمل تھا جو وہ مختلف شعرا پر 'نگار' میں شائع کرتے تھے۔ ماہنامہ 'شاعر' اور 'قصر الادب' آگرہ میں تھے اور حضرت سیماب کراچی میں، ان کا دل ہمیشہ آگرہ اور تاج محل کے لیے تڑپتا رہتا جو ان کے اس دور کے کلام میں صاف نظر آتا ہے لیکن وہ مجبور تھے۔

ریڈیو پاکستان سے روزانہ اردو مصادر پر ان کی تقریر نشر ہوتی تھی جو ان کے حصول معاش کا ایک بڑا ذریعہ تھا۔ یہاں ان کے اختراعی ذہن نے ایک اور اہم کارنامہ انجام دیا۔ انھوں نے کراچی میں اپنی نوعیت کا اولین انسٹی ٹیوٹ 'جامعہ ادبیہ' قائم کیا جس کے نصاب میں اردو صرف و نحو، فن شاعری، نثر نگاری کی تربیت اور صحافت کی تربیت شامل تھے۔ گو کہ یہ جامعہ زیادہ عرصہ تک جاری نہ رہ سکا اور کچھ مدت کے بعد مروجہ اکیڈمک اسکول ہو گیا۔ آج جرنلزم کا کورس خاصی اہمیت کا حامل ہے لیکن اس دور میں اردو کا کوئی کورس مروج نہیں تھا اور نہ ہی کبھی کسی ادارے میں باقاعدہ شاعری کا فن سکھایا گیا۔ اس کی اولیت کا سہرا بھی حضرت سیماب ہی کے سر بندھتا ہے۔ عمر کے اس پڑاؤ میں بھی وہ مسلسل فعال تھے۔ شعر بھی کہتے تھے، نظمیں بھی لکھتے تھے اور اصلاح سخن بھی فرماتے تھے۔ ان کی موجودگی سے کراچی کی ادبی فضا میں ایک گرمی سی پیدا ہو گئی تھی۔ انھوں نے وہاں 'انجمن ترویج اردو' بھی قائم کی جس کے تحت ان کے مکان پر ہر ماہ ادبی جلسے، طرحی مشاعرے اور فی البدیہہ مشاعروں کا سلسلہ جاری تھا۔

ان تمام سرگرمیوں کے باوجود ان کے دل میں اپنے وطن عزیز ہندوستان کی یاد ہمیشہ روشن رہی، انھوں نے 3 مئی 1949 کو ضیا فتح آبادی کو جو خط لکھا تھا اس کا ایک اور حصہ ملاحظہ فرمائیں:

"محترمی ڈاکٹر سیتا رام بالقابہ ہائی کمشنر انڈیا سے یہاں ایک ادبی اجتماع میں ملاقات ہوئی، فرمایا، سیماب صاحب کیا اب آپ سے ہم بالکل محروم ہو جائیں گے؟

itsurdu.blogspot.com

کتنا دلآویز درد انگیز انتظار تھا۔ آنکھیں پرنم ہوگئیں۔ دل بھر آیا۔ میں نے عرض کیا، میں پہلے ہندستانی ہوں اور اس کے بعد سب کچھ ہوں۔ بین الاقوامی شاعر ہوں۔ مجھے نہ ہندستان سے بیر ہے نہ پاکستان سے۔ آب و دانہ یہاں لے آیا ہے۔ جب چاہوں گا۔ پھر ہندستان چلا جاؤں گا... نہ میں ہندستان کو بھول سکتا ہوں نہ ہندستان مجھے...''

اور یہ حقیقت بھی ہے کہ وہ سرحدوں کے قائل نہ تھے پھر بھی آخری سانس تک سچے ہندستانی رہے۔

وہ کراچی جس کام کے لیے گئے تھے وہ تو ہو نہ سکا یعنی تاج کمپنی نے 'وحی منظوم' شائع نہیں کی لیکن کمپنی کے مینجنگ ڈائریکٹر نے ایک روز ان سے فرمائش کی کہ وہ تاج کمپنی کے لیے ایک جامع، مستند اور مبسوط سیرۃ النبی تحریر فرما دیں۔ حضرت سیماب نے ان سے کہا بھی کہ سیرۃ مبارکہ پر ایک سے ایک مستند اور معتبر کتاب موجود ہے جن علمائے عظام نے یہ کتابیں تحریر فرمائی ہیں میں تو ان کی خاک پا بھی نہیں ہوں، اس کے باوجود وہ نہ مانے اور اصرار کرتے رہے، لہٰذا حضرت سیماب نے اس کام کی حامی بھر لی۔ اس سے قبل وہ خاصے علیل تھے اور ستمبر 1949 میں ان پر فالج کا حملہ بھی ہو چکا تھا لیکن ان کی اجتہادی شخصیت نے انھیں اس کام کا حوصلہ دیا اور اس میں بھی شاید تائید ربانی شامل تھی کہ قرآن مجید کا مکمل منظوم ترجمہ کرنے والا اپنی آخری عمر میں سیرت پاک بھی تحریر کرتا جائے۔ انھوں نے دو مہینے میں ایک جامع ''سیرت النبی'' تحریر کر دی جسے تاج کمپنی نے بڑے اہتمام سے شائع کیا۔ یہ ان کی تحریر کردہ آخری تصنیف تھی۔ شاید فالج کے پہلے حملے سے صحت یاب ہو جانا بھی اس اہم ترین کام کو انجام دینے کے لیے ہی تھا۔

حضرت سیماب 30 ستمبر 1950 کی شب 'بزم سیماب کراچی' کے ماہانہ مشاعرے میں شریک ہوئے جس کی صدارت حضرت حفیظ ہوشیار پوری نے فرمائی تھی (واضح رہے کہ اس دور میں آگرہ، دہلی، لاہور، کراچی اور برصغیر کے کئی شہروں میں 'بزم سیماب' قائم تھی)۔ اس وقت تک صحت بہت بہتر تھی لیکن دوسرے روز ان پر فالج کا دوسرا حملہ ہوا، الفاظ الجھے الجھے ادا ہونے لگے اور پھر رفتہ رفتہ طبیعت بگڑتی ہی چلی گئی۔ ان کے دو فرزند سجاد حسین اور مظہر

حسین اس وقت ان کے قریب ہی تھے جب کہ دونوں بڑے بیٹے منظر صدیقی اور اعجاز صدیقی آگرہ ہی میں رسالہ شاعر اور قصر الادب کی ذمہ داریاں سنبھالے ہوئے تھے۔ حضرت سیماب کو ذیابیطس اور بلڈ پریشر کی بھی شکایت تھی۔ زبان میں لکنت کے ساتھ ساتھ آہستہ آہستہ تحریر بھی بگڑتی چلی گئی۔ اس دور کے کئی نامور ڈاکٹروں نے ان کا علاج کرنے کی کوشش کی لیکن سب ہی ناکام رہے، ایلوپیتھی علاج کے ساتھ یونانی علاج بھی کروایا گیا۔ ہمدرد دواخانہ کے حکیم عبدالحمید مرحوم اور ان کے بھائی حکیم محمد سعید مرحوم وغیرہ نے بھی معالجہ کیا لیکن کوئی کوشش کارگر نہ ہوسکی۔ ان کی عیادت کے لیے کئی نامور ادیب اور شاعر اکثر ان کے ہاں آتے جاتے رہے وہ بھی جو وہاں مقیم تھے اور وہ بھی جو ہندوستان سے کچھ دنوں کے لیے گئے تھے ان شخصیات میں مولانا حسرت موہانی، جگر مرادآبادی، ساغر نظامی، شکیل بدایونی، مولانا ماہرالقادری، نہال سیوہاروی، رئیس احمد جعفری، ضیاالدین برنی، راغب مرادآبادی، ذوالفقار علی بخاری، تخشب جارچوری وغیرہ شامل ہیں۔ دوران علالت ایک روز اچانک ان کی قوت گویائی پھر لوٹ آئی اور طبیعت کچھ کچھ سنبھلنے بھی لگی لیکن یہ معاملہ زیادہ دنوں تک نہیں رہا۔ ایسی علالت میں بھی شعر کہنے کا عمل جاری تھا، اور لکنت کے باوجود وہ شعر کہہ کر اپنے فرزند مظہر مرحوم کو لکھوا دیتے تھے۔ ان کے اشعار میں موت کے قدموں کی آہٹ صاف محسوس کی جاسکتی تھی یا پھر ایسے اشعار جن میں ارض تاج کی یادیں شامل ہوں۔ ان کی علالت کے تفصیلی حالات مظہر صدیقی مرحوم نے قلم بند کیے تھے جو ماہنامہ پرچم کراچی کے تعزیت نمبر شمارہ نمبر 20 جلد نمبر 2 (1951) میں شائع ہوئے۔ اعجاز صدیقی مرحوم بھی کچھ دنوں کے لیے آگرہ سے کراچی گئے تھے لیکن بہ حالت مجبوری چند روز بعد ہی انھیں لوٹ آنا پڑا۔ لیکن اعجاز مرحوم سے دوران علالت انھوں نے جو جملے کہے تھے ان جملوں سے ان کی ذہنی کیفیت کا اندازہ لگایئے:

''اعجاز حسین... مصائب سے گھبرانا نہیں... خود اعتمادی سے کام لینا... میرے مشن کو جاری رکھنا... میری تحریکوں کو آگے بڑھانا... میرے تمام شاگردوں کو متحد کرنا... میری بقیہ کتابوں کو مرتب کرکے چھپوانا... تم... تم... تم ذمہ دار ہو... اللہ تمھاری مدد کرے... میں کراچی میں مرنا نہیں چاہتا، مجھے آگرہ لے چلو۔''

itsurdu.blogspot.com

(پیارے ابا جی۔ از: اعجاز صدیقی، مطبوعہ سالنامہ شاعر ممبئی، اپریل 1951)

لیکن موت پر کس کا بس چلتا ہے۔ آخر 31 جنوری 1951 بروز بدھ صبح 11 بجے اردو کا ایک مجدد اپنے مالک حقیقی سے جاملا۔ کراچی ہی میں تدفین ہوئی اور کتبے پر ان کا یہ شعر کندہ کروایا گیا:

کہانی ہے تو اتنی ہے فریب خواب ہستی کی
کہ آنکھیں بند ہوں اور آدمی افسانہ ہو جائے

دونوں ممالک کے ریڈیو اسٹیشنوں سے انتقال کی خبر متعدد بار نشر کی گئی اور خصوصی پروگرام پیش کیے گئے علمی اور ادبی حلقوں میں کہرام مچ گیا۔ ان کے مخالفین کی بھی آنکھیں بھر آئیں، آگرہ، کراچی اور لاہور کے اردو اور انگریزی روزناموں نے خصوصی ضمیمے شائع کیے۔ برصغیر کے کئی شہروں میں تعزیتی جلسے ہوئے۔ لیکن حضرت سیماب افسانہ نہیں ہوئے آج بھی وہ اپنی تحریروں اور تحریکوں کے ذریعے زندہ ہیں۔ ماہنامہ شاعر ممبئی کا ہر شمارہ آج بھی ان کے زندہ ہونے کا ثبوت دیتا ہے۔

○

شخصیت

حضرت سیماب کو ان کے معاصرین اور شاگرد علامہ، مولانا، قبلہ یا حضرت کہہ کر مخاطب کرتے تھے، ان کا نام اس دور کے کئی رسائل و کتب میں اس طرح چھپا ہے: ابوالفخر علامہ مولانا شیخ عاشق حسین سیماب صدیقی الوارثی۔ لیکن بعض جگہ نام سے قبل 'افصح الملک' کا خطاب بھی لکھا ملتا ہے جو غالباً والی ریاست ٹونک نے دیا تھا۔ آج بھی عموماً انھیں علامہ یا استاذ الاساتذہ جیسے القاب سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ انھوں نے خود اپنے لیے خطابات کو پسند نہیں کیا ورنہ انگریزی حکومت سے 'سر' یا 'شمس العلما' کا خطاب حاصل کر لینا ان کے لیے بہت دشوار نہیں تھا۔ ان کے سراپا، عادات و اطوار اور عقائد کے تعلق سے چند بیانات پیش کرنا چاہتا ہوں۔ جانشین سیماب اعجاز صدیقی مرحوم نے ماہنامہ شاعر ممبئی شمارہ 4-5، 1976 میں ان کی شخصیت کا خاکہ یوں کھینچا ہے۔

"... گورا چٹا رنگ، بھرا ہوا جسم، میانہ قد، نہایت پُرکشش غلافی آنکھیں، چوڑی پیشانی، چال میں وقار، گفتگو میں ٹھہراؤ، عالمانہ لہجہ، نہایت مشفق، خدا ترس اور رقیق القلب، کم سخن، چہرہ رعب دار، بے حد خوش عقیدہ، اپنے مذہب میں راسخ العقیدہ ہونے کے باوجود دوسرے مذاہب کا پورا پورا احترام کرتے تھے۔ جہاں یوم النبیؐ اور یوم حسینؓ شاندار پیمانے پر مناتے تھے وہیں ہولی، دیوالی اور بسنت کے پروگراموں میں بھی نہایت خوش دلی سے حصہ لیتے تھے۔ جہاں انھوں نے رسول اکرمؐ پر متعدد نظمیں اور نعتیں لکھیں وہیں شری کرشن جی، مہاتما بدھ اور گرونانک پر بھی نظمیں لکھیں۔ وہ گہرا سیاسی شعور رکھتے تھے مگر عملی سیاست میں کبھی حصہ نہیں لیا... ان کا مطالعہ بے حد وسیع تھا۔ تقریر کرنے کے عادی نہ تھے مگر تحریر کا یہ عالم تھا کہ نظم ہو یا نثر یوں محسوس ہوتا تھا کہ کوئی بول رہا ہے اور وہ لکھ رہے ہیں..."

ان کی شخصیت کے چند پہلو جو میں نے بزرگوں اور خصوصاً اپنی والدہ بیگم نسیم اعجاز صدیقی سے سنے ہیں ان کے مطابق وہ افراط خانہ کو ڈانٹنے کے عادی نہ تھے، بلکہ اگر کوئی

itsurdu.blogspot.com

ناگوار بات ہوتی تو لوگ ان کی آنکھوں سے فوراً ان کے غصے کو محسوس کر لیتے لیکن یہ غصہ بھی تادیر قائم نہ رہتا۔ وہ نواسیر کے مستقل مریض تھے۔ پان اور سگریٹ دونوں کے عادی تھے لیکن پائیریا ہونے کے بعد پان ترک کر دیا تھا۔ نذر و نیاز کا بڑا اہتمام کرتے تھے اور بزرگان دین کے مزارات پر بھی حاضری دیتے تھے لیکن ان مقامات پر ہونے والی خرافات کے مخالف تھے۔ بچوں سے بہت پیار کرتے تھے، اپنے پوتے پوتیوں اور نواسیوں میں انھیں افتخار امام (فرزند اعجاز) سے بہت زیادہ لگاؤ تھا، گھر کی خواتین خصوصاً بہوؤں کو بہت کم مخاطب کرتے تھے۔ کھانے کے بہت شوقین تھے لیکن تاحیات کبھی شراب کو ہاتھ نہ لگایا۔ مظہر حسین صدیقی نے اپنے والد کے بارے میں ایک تفصیلی مضمون 'وحی منظوم' کی طبع اول کی ابتدا میں لکھا ہے، اس کے چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیں:

"میرے ابا جی انتہائی بااصول آدمی تھے... ابا جی قلم کو اپنے ہاتھ میں ایک امانت تصور کرتے تھے، اپنے علم و اعتقاد کو اللہ جل شانہ کا عطیہ اور کرم خاص کہا کرتے تھے۔ وہ ہمیشہ الصلوٰۃ خیر من النوم کی صدا سے قبل بیدار ہو جاتے، فجر کی نماز ادا فرماتے پھر قریب ہی کے ایک سبزہ زار میں چہل قدمی کے لیے چلے جاتے، باغ سے واپس آکر ضروریات سے فارغ ہوتے، ناشتہ کرتے پھر قرآن کریم کی تلاوت فرماتے، ان معمولات سے فارغ ہو کر خاندانی مسائل یا گھریلو امور میں دلچسپی لیتے، صلاح مشورے میں حصہ لیتے۔ پوتیوں اور پوتوں سے حد درجہ محبت کرتے تھے، سب کی فرمائشیں سنتے، پیسے دیتے اور پھر قصرالادب جو مکان سے زیادہ دور نہ تھا، تشریف لے جاتے، گزشتہ روز کے موصولہ وہ خطوط ان کے مخصوص کمرے میں رکھ دیے جاتے تھے جن میں ان کے تلامذہ کا کلام اصلاح کی غرض سے ہوتا تھا ایک بجے تک ابا جی موصولہ کلام پر اصلاح مع توجیہ فرماتے رہتے پھر قصرالادب ہی میں کھانا کھاتے، نماز ظہر ادا کر کے تھوڑی دیر آرام کرتے اور پھر کچھ دیر تک رسائل و اخبارات وغیرہ دیکھتے رہتے اس کے بعد شام تک تصنیف و تالیف اور تخلیقی کاموں میں مصروف رہتے، چائے بہت کم پیتے تھے البتہ حقہ یا سگریٹ کے کش جاری رہتے، مغرب سے ذرا پہلے گھر آجاتے اور مغرب کی نماز کے فوراً بعد گھر کے تمام افراد کے ساتھ رات کا کھانا کھا لیتے، کھانے کے بعد تھوڑی دیر بچوں کے ساتھ ہنستے بولتے اور گئی رات تک چلنگ پر تکیوں کے سہارے نیم دراز ہو کر تصنیف و تالیف کا سلسلہ حقے کے کشوں کے ساتھ جاری رہتا۔

مقامی مشاعروں میں ابا جی بہت کم شریک ہوتے تھے، البتہ ہر ماہ آٹھ دس روز و شب بیرونی مشاعروں کی شرکت اور صدارت کی نذر ہو جاتے تھے۔ آگرہ سے چند روز کی غیر حاضری میں ایسے خطوط کا انبار لگ جاتا جن کا تعلق براہ راست ابا جی سے ہوتا تھا۔ سفر سے واپسی کے بعد سب سے پہلے ان خطوط کے جواب لکھنا وہ اپنا فرض سمجھتے تھے۔ مقامی تلامذہ کے کلام پر اصلاح دینے کے لیے بھی وہ کسی نہ کسی طرح وقت نکال لیا کرتے تھے۔ دیکھنے والے تعجب کرتے تھے کہ سیماب صاحب نواسیر کے تکلیف دہ مرض میں مبتلا ہونے کے باوجود سترہ اٹھارہ گھنٹے کس طرح دماغی محنت کر لیتے ہیں۔

اس طویل مضمون میں مظہر مرحوم سے یہ بھی اطلاع ملتی ہے کہ حضرت سیماب کو 'تاج الشعرا' اور 'شاعر تاج' کے خطابات بھی دیے گئے تھے۔ ضیا فتح آبادی نے 'ذکر سیماب' میں شاگرد سیماب حضرت نثار اٹاوی کا ایک پیراگراف نقل فرمایا ہے جو 'نقوش' لاہور کے شخصیات نمبر میں شائع ہوا تھا:

"مولانا اس وقت باوجود عمر کی 55 منزلیں طے کرنے کے کافی تنومند تھے۔ قد چھوٹا تھا مگر ان کی ترکی ٹوپی اُسے درازی عطا کر دیتی تھی۔ سر کے بال سفید ہو چکے تھے اور انگریزی وضع پر ترشے رہتے تھے۔ مولانا کا چہرہ گول، آنکھیں بڑی اور چمک دار تھیں۔ ان کی آواز کافی رعب دار تھی۔ مونچھوں کے بال بہت کم اگتے تھے، داڑھی صفا چٹ رہتی تھی۔ آخر عمر میں نحیف سا جسم ہو گیا تھا مگر چھڑی کے سہارے نہایت تیز رفتاری کے ساتھ چل سکتے تھے۔ میں نے انھیں کبھی پرتکلف لباس میں نہیں دیکھا۔ البتہ میں ایام شباب کی تصویر دیکھ کر یہ ضرور معلوم ہوا کہ وہ کسی زمانے میں سوٹ بھی پہنتے ہوں گے مگر شاید جوانی کے ساتھ یہ شوق بھی رخصت ہو گیا۔ میں نے انھیں ہمیشہ شیروانی اور چوڑے پائنچے کے پاجامے میں ملبوس دیکھا۔ گھر پر قمیض اور تہبند یا پاجامے کے عادی تھے اگر گرمی کی شدت ہوتی تھی تو صرف بنیان اور تہبند پر اکتفا کرتے تھے مگر بغیر شیروانی اور ٹوپی کے مکان یا دفتر سے باہر جانا معیوب سمجھتے تھے۔ انھیں ترکی ٹوپی بہت عزیز تھی، کبھی کبھی جاڑے میں سمور کی ٹوپی بھی استعمال کرتے تھے، یہ سیمیا کے کانٹوں جیسی گھنی بھورے بالوں والی ٹوپی ان کے پُر رعب چہرے کو اور بھی باوقار بنا دیتی تھی۔"

itsurdu.blogspot.com

حضرت سیماب کی شخصیت کے ایک پہلو پر سید عزیز حسن بقائی (مدیر 'پیشوا') نے ماہنامہ پرچم کراچی کے تعزیت نمبر میں اشارہ کیا ہے، لکھتے ہیں:

"... مجھے معلوم تھا کہ مولانا بغیر معاوضے کے نہیں لکھا کرتے۔ کیوں کہ اس ناقدری کے دور میں اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا، لیکن میں نے کبھی معاوضہ دیا ہی نہیں۔ اول تو میں مولانا کے جواہر پاروں کا معاوضہ دے ہی نہیں سکتا تھا دوسرے مجھے مولانا نے کبھی ہلکا سا اشارہ بھی نہیں کیا، کیوں کہ حضرت علامہ میری مالی مشکلات سے بخوبی آگاہ تھے۔"

اسی رسالے میں محشر بدایونی نے ایک واقعہ یوں بیان کیا ہے:

"... جامعہ ملیہ دہلی میں ایک مشاعرہ تھا وہاں میں نے اپنی ایک نظم 'تاج محل' پڑھی۔ میں نے دیکھا کہ تمام حاضرینِ بزم مجھے دل کھول کر داد دے رہے ہیں۔ مگر سیماب صاحب خاموش ہیں اور وجد کی کیفیت میں ہل رہے ہیں۔ ان کا وہ ہلنا میرے لیے اس قدر ہمت افزا تھا کہ سامعین کی داد کا مجھ پر اتنا اثر نہ تھا جتنا مولانا سیماب کی اس خاموش داد سے میں متاثر ہوا تھا۔"

اب ذرا حضرتِ سیماب کی داد کے تعلق سے 'ذکرِ سیماب' میں حضرت ضیا کا بیان بھی دیکھیں:

"سیماب کے تعلق سے ایک عام خیال کہ وہ سرِ مشاعرہ شعر کی داد دینے میں بخیل تھے، بجا کافی درست ہے۔ انھوں نے ایک گفتگو میں راقم السطور سے کہا تھا کہ اچھے شعر سننے میں کم کم آتے ہیں۔ تاہم سرِ مشاعرہ داد نہ دینے کا خاص سبب یہ تھا کہ وہ مشاعروں کو نہ 'داد گاہیں' سمجھتے تھے نہ بنانا چاہتے تھے... دراصل اسے سیماب کی فطری سنجیدگی کا کارنامہ کہنا چاہیے۔"

رسالہ پرچم کے محولہ شمارے میں مولانا ماہر القادری مرحوم کی تحریر موجود ہے جو ان کے وقیع رسالے فاران (اپریل 1951) میں شائع ہوئی۔ چند جملے دیکھیں:

"... ایک بار میں حضرت سیماب کے دولت کدہ پر ایک دن کے لیے ٹھہرا بھی تھا بڑی تواضع سے پیش آئے۔ صبح کے وقت ان کا معمول تھا کہ نماز پڑھ کر شہد اور انڈے کا ناشتہ کرتے اور تھوڑی دور ٹہلنے کے لیے نکل جاتے۔ پھر میں نے یہ منظر بھی اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ قصرالادب میں تکیہ کے سہارے تخت پر جھکے ہوئے بیٹھے

ہیں، شاگردوں کی غزلیں اور نظمیں پھیلی ہوئی ہیں اور اصلاح دیتے چلے جاتے ہیں۔

... اردو زبان کے وہ پہلے شاعر ہیں جنھوں نے ادارۂ تصنیف و اصلاح قائم کیا جہاں اجرت پر ناول، کتابیں، نظمیں، غزلیں اور سہرے لکھے جاتے تھے، مجھے یاد پڑتا ہے کہ ایک اشتہار میں 'دیوان' کی اجرت پانچ سو روپے درج تھی۔ حضرت سیماب کی شاعرانہ قوتیں دوسروں پر کافی صرف ہوئیں، کاش وہ تمام کی تمام انہی کے کام آتیں۔ پُرگوئی اور زود گوئی کا یہ عالم تھا کہ نثر کی طرح کاغذ پر شعر لکھتے جاتے تھے، وہ دس بارہ منٹ میں ایک غزل کہہ لیا کرتے تھے۔ ان کا دماغ کثرتِ شعر گوئی کے سبب شعر سازی کی سچ مچ ایک مشین بن گیا تھا..."

ابھی کئی اقتباسات باقی ہیں لیکن سب کچھ تو اس کتاب میں پیش نہیں کرسکتا۔ یہ حضرت سیماب کی شخصیت کا ایک قلمی کولاج ہے۔ خود انھوں نے کہا تھا:

بھرے گی ان کو میرے بعد لاکھوں رنگ سے دنیا
خلائیں چھوڑ دی ہیں میں نے کچھ اپنے فسانے میں

○

itsurdu.blogspot.com

تصنیفات سیماب

حضرت سیماب اکبرآبادی نے نظم ونثر کی تقریباً تین سو کتابیں لکھیں جن میں نصف سے زیادہ اشاعت سے محروم رہ گئیں اور وقت کے ساتھ ساتھ ان میں سے بیشتر کے مسودے بھی نہ رہے لیکن مختلف لوگوں کے مضامین اور تذکروں سے ان کتابوں کا پتہ ملتا ہے۔ 'کلیم نجم' میں خود انھوں نے چند کتابوں کا ذکر کیا ہے، اس کے علاوہ ضیا فتح آبادی کی کتاب 'ذکر سیماب' اور راز چاند پوری کی کتاب 'داستانِ چند' میں کئی کتابوں کا ذکر ہے۔ اعجاز صدیقی مرحوم نے سیماب اکیڈمی ممبئی کے ذریعہ ان کی کتابوں کی فہرست ایک کتابچے کی صورت میں شائع کی تھی۔ ان تمام ماخذات کی روشنی میں افتخار امام صدیقی صاحب نے ایک فہرست 'شاعر' کے 'ہم عصر اردو ادب نمبر' میں شائع کی۔ یہاں چند اضافوں کے ساتھ اس عظیم تخلیق کار کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابوں کی تفصیل درج کر رہا ہوں لیکن یہ فہرست بھی نامکمل ہی ہے:

غزلیات

کلیم نجم: طبع اول۔ قصر الادب آگرہ، 1936 (مع 14 خطبات شاعری) طبع دوم۔ قصر الادب آگرہ، جولائی 1947، طبع سوم۔ سیماب اکادمی کراچی۔ نومبر 1985۔

سدرۃ المنتہیٰ: طبع اول، مکتبہ قصر الادب آگرہ، ستمبر 1946، لوحِ محفوظ: طبع اول۔ سیماب اکادمی ممبئی۔ مارچ 1979، طبع دوم۔ سیماب اکادمی کراچی، نومبر 1983، طبع سوم۔ (جعلی ایڈیشن) حسامی بک ڈپو حیدرآباد فروری 1994۔

منظومات

نیستاں: طبع اول۔ مکتبہ قصر الادب آگرہ۔ 1925 (57 نظموں کا مجموعہ) کارِ امروز:

طبع اول۔ مکتبہ قصر الادب آگرہ۔ 1934 (137 نظموں کا مجموعہ)، طبع دوم۔ مکتبہ قصر الادب آگرہ۔ جولائی 1947، ساز و آہنگ: طبع اول۔ مکتبہ قصر الادب آگرہ۔ اپریل 1941 (149 نظموں کا مجموعہ) جنت کے خطوط: طبع اول۔ دین دنیا پبلشنگ ہاؤس دہلی (نیستاں سے نظموں کی ایک سیریز) شعرِ انقلاب: طبع اول۔ مکتبہ قصر الادب آگرہ۔ دسمبر 1947 (139 نظموں کا مجموعہ) سازِ حجاز: طبع اول۔ سیماب اکاڈمی کراچی۔ 1984 (اسلامی نظموں کا مجموعہ۔ مرتب: مظہر حسین صدیقی) سرودِ غم: طبع اول۔ مکتبہ قصر الادب آگرہ۔ جنوری 1941 (واقعۂ کربلا کے تعلق سے نوحے اور سلام) طبع دوم مکتبہ قصر الادب آگرہ۔ دسمبر 1948، طبع سوم مکتبہ پرچم کراچی۔ 1958، طبع چہارم۔ مکتبہ سیماب کراچی۔ 1967، نغمۂ غم: طبع اول۔ قصر الادب آگرہ۔ ستمبر 1943 (واقعۂ کربلا کے تعلق سے نوحے اور سلام) طبع دوم۔ قصر الادب آگرہ۔ دسمبر 1948، طبع سوم۔ مکتبہ پرچم کراچی۔ جولائی 1958، طبع چہارم۔ مکتبہ سیماب کراچی۔ 1967 ستونِ کعبہ: غیر مطبوعہ (عزائی شاعری۔ مرتب: مظہر حسین صدیقی) قائد کی خوشبو: طبع اول۔ سیماب اکاڈمی کراچی۔ دسمبر 1967 (مرتب: مظہر حسین صدیقی) نورتن: غیر مطبوعہ (نو تو اشعار کی اصلاحی اور واقعاتی نظمیں) آزادی کے ہیرو اور دوسری نظمیں: غیر مطبوعہ (کانگریسی رہنماؤں اور تحریکوں پر نظمیں) لوری نامہ: طبع اول۔ ابو العلائی پریس آگرہ۔ 1917 (بچوں کو سلانے کے لیے 18 لوریاں) نظم باقی: غیر مطبوعہ۔ (وہ نظمیں جو کسی مجموعے میں شامل نہیں۔ مرتب: افتخار امام صدیقی) مراثی سیماب: غیر مطبوعہ (12 طویل مرثیے) قصائد سیماب: غیر مطبوعہ (8 طویل قصیدے) کرشن گیتا: طبع اول۔ انڈین پریس لمیٹیڈ الہ آباد 1942 (شری کرشن جی پر 12 طویل نظمیں) فریاد: طبع اول۔ حکیم محمد یعقوب خاں دہلی۔ 1920 (31 بند کی مسدس جس میں بارگاہ رسالت مآب میں فریاد کی گئی ہے) ریاضِ اظہر: طبع اول۔ کے حاجی محی الدین بنگلور (منظوم حیاتِ طیبہ) بن بنسی: طبع اول۔ ڈسٹرکٹ گزٹ پریس ایٹہ یوپی (گرام سدھار گیت۔ دیہاتی زبان میں)

منظوم تراجم

وحی منظوم: طبع اول۔ (پارۂ عم) مکتبہ سیماب کراچی۔ نومبر 1953 (قرآن مجید کے

itsurdu.blogspot.com

مکمل تیس پاروں کا منظوم ترجمہ)، طبع دوم: (مکمل) سیماب اکاڈمی کراچی۔ نومبر 1981، طبع سوم: سیماب اکاڈمی کراچی، طبع چہارم: سیماب اکاڈمی کراچی، طبع پنجم: سیماب اکاڈمی کراچی، طبع ششم: سیماب اکاڈمی کراچی، طبع ہفتم: (جعلی ایڈیشن) فرید بک ڈپو دہلی الہام منظوم: طبع اول۔ فیروز اینڈ سنز لاہور۔ 1948 (مثنوی مولانا روم کا مکمل منظوم ترجمہ۔ 6 جلدوں میں) طبع دوم ملک دین محمد اینڈ سنز لاہور 1949، ارشاد احمد: طبع اول۔ عزیزی پریس آگرہ (احادیث نبوی کا منظوم ترجمہ)، جامع الخطب: طبع اول۔ کے حاجی محی الدین بنگلور (مرتبہ خطبات عربی کا منظوم ترجمہ)، عزیز الخطب: طبع اول کے حاجی محی الدین بنگلور (خطبات عزیزیہ کا منظوم ترجمہ)

رباعیات، قطعات

عالم آشوب: طبع اول۔ قومی محاذ جنگ صوبہ متحدہ لکھنؤ۔ 1944 (جنگ عظیم کے پس منظر میں 300 سے زائد رباعیاں) آیات سخن: غیر مطبوعہ (200 سے زائد رباعیاں) شعری کتبے: غیر مطبوعہ (کئی سو قطعات، تاریخ) ہمارا پیام: غیر مطبوعہ (قطعات و رباعیات کی شکل میں سیاسی و واقعاتی پیغامات)

دیگر منظومات

گلدستۂ عطار: (چوتھا حصہ) طبع اول۔ ابوالعلائی پریس آگرہ زنانہ میلاد: طبع اول۔ ابوالعلائی پریس آگرہ۔ نغمۂ معصوم: غیر مطبوعہ۔ (بچوں کی نظمیں، ان میں سے کچھ 'ساز و آہنگ' میں شامل ہیں) شعر منثور: غیر مطبوعہ (تجرباتی سطح پر نثری نظموں کی ابتدائی شکل)

خطبات

خطبات شاعری: (حصہ اول) (14 خطبات صدارت جو 'کلیم عجم' کے اولین ایڈیشن میں شامل ہیں) خطبات شاعری: (حصہ دوم) غیر مطبوعہ (24 خطبات صدارت) خطبہ صدارت مسالمہ کراچی (یوم عاشورہ پر یادگار خطبہ 'سرود غم' کے طبع چہارم میں شامل ہے) شہیدوں کی یادگاریں: (خطبۂ صدارت مسالمہ آگرہ 'نفیر غم' کے طبع دوم میں شامل ہے)

تنقید و تحقیق

دستور الاصلاح: طبع اول۔ مکتبہ قصر الادب آگرہ۔ جولائی 1940 (فن اصلاح شاعری پر جامع کتاب)، طبع دوم۔ مکتبہ قصر الادب آگرہ۔ جولائی 1944، طبع سوم۔ مکتبہ قصر الادب آگرہ۔ 1946 طبع چہارم۔ مکتبہ سیماب کراچی۔ 1970، رازِ عروض: طبع اول۔ مکتبہ قصر الادب آگرہ۔ 1923 (فنِ شاعری پر آسان کتاب)، طبع دوم۔ مکتبہ قصر الادب آگرہ۔ 1933، طبع سوم۔ مکتبہ قصر الادب آگرہ۔ 1942، طبع چہارم۔ مکتبہ قصر الادب آگرہ۔ 1949، طبع پنجم۔ مکتبہ سیماب کراچی۔ 1953، طبع ششم۔ مکتبہ پرچم کراچی۔ 1958، طبع ہفتم۔ مکتبہ سیماب کراچی۔ 1967، طبع ہشتم۔ مکتبہ سیماب کراچی۔ 1970، ادب پارے: غیر مطبوعہ۔ (مختصر تاثراتی اور فکری تحریریں)۔ جدید شرح دیوان غالب: غیر مطبوعہ، اصلاحات سیماب: غیر مطبوعہ (تلامذہ کے کلام پر اصلاحیں اور ان کی توضیح)، شاہراہ: غیر مطبوعہ (عربی اور فارسی عروض سے ہٹ کر اردو کے اپنے عروض کی ضرورت پر بحث اور امکانات کے اشارے)، کتاب اسلف: غیر مطبوعہ (چند قدیم شعراء کا تذکرہ)، مضامین سیماب: غیر مطبوعہ (تاریخی، علمی اور تنقیدی مضامین) علیہ ما علیہ: غیر مطبوعہ (نیاز فتح پوری کے مالہ و ما علیہ کا جواب بطور ادبی معرکے)، منہاج الادب: غیر مطبوعہ (ادبی و تنقیدی مضامین)، ناظمین اردو: غیر مطبوعہ (معاصر شعراء کا تذکرہ)، نکاتِ فن: غیر مطبوعہ (عروض، قواعد اور فن پر مباحث)

سیرت اور سوانح

سیرت النبویؐ: طبع اول۔ تاج کمپنی لمیٹڈ لاہور، غوث الاعظمؒ: طبع اول۔ ابوالعلائی پریس آگرہ، سیرۃ الکبریٰؓ: طبع اول۔ صوفی پبلشنگ ہاؤس منڈی بہاؤ الدین (پاکستان) 1916، سیرۃ الحسینؓ: طبع اول۔ صوفی پبلشنگ ہاؤس منڈی بہاؤالدین (پاکستان) 1916، سوانح نور جہاں بیگم: طبع اول۔ ابوالعلائی پریس آگرہ۔ 1920، سوانح زیب النساء بیگم: طبع اول۔ ابوالعلائی پریس آگرہ، ذکرِ صبر ایوبؑ: طبع اول۔ ابوالعلائی پریس آگرہ، خدیجۃ الکبریٰؓ: طبع اول۔ عزیزی پریس آگرہ، چراغ داغ: طبع اول۔ صوفی پبلشنگ ہاؤس منڈی بہاؤالدین پاکستان، حالاتِ حالی۔ طبع اول۔ صوفی پبلشنگ ہاؤس منڈی بہاؤالدین

itsurdu.blogspot.com

(پاکستان)۔ تذکرہ (حیات) صابرؔ: طبع اول ابو العلائی پریس آگرہ، تذکرۃ الرسولؐ: طبع اول، عزیزی پریس آگرہ، تحفہ دربار ولایت: طبع اول ابو العلائی پریس آگرہ، بنتِ رسولؐ: طبع اول۔ عزیزی پریس آگرہ، ائمۃ الہدیٰ: طبع اول۔ ابو العلائی پریس آگرہ، انور العلا: طبع اول۔ ابو العلائی پریس آگرہ، اللہ والوں کی محفل: طبع اول۔ ابو العلائی پریس آگرہ، سوانح خواجہ غریب نوازؒ: طبع اول۔ ابو العلائی پریس آگرہ

افسانہ، ڈراما، ناول

اساطیر: غیر مطبوعہ: (افسانے جو حضرت سیماب نے خود منتخب کر لیے تھے)

سیماب کے افسانے: غیر مطبوعہ۔ (وہ افسانے جو 'اساطیر' میں شامل نہیں)، آفتاب زندگی: طبع اول۔ حکیم محمد یعقوب خاں دہلی (اصلاحی ناول)، آئینہ: طبع اول۔ بال کشن مشین پریس آگرہ (آئینہ سے متعلق حضرت داغ کے اشعار پر مشتمل ناول)، شباب زندگی: طبع اول۔ حکیم محمد یعقوب خاں دہلی (دو حصوں پر مشتمل ناول)، شکیلہ بیگم: طبع اول۔ ابو العلائی پریس آگرہ (ناول)، وفا کی دیوی: طبع اول۔ ابو العلائی پریس آگرہ (اصلاحی ناول)، پیچ در پیچ: طبع اول۔ ابو العلائی پریس آگرہ (مکمل ڈراما)، داؤ پیچ یا خوبصورت بلا: طبع اول۔ ابو العلائی پریس آگرہ (ڈراما)، فریب وفا عرف بناؤ بگاڑ: طبع اول۔ عزیزی پریس آگرہ (ڈراما)، ناکام تمنا: طبع اول۔ ابو العلائی پریس آگرہ (ڈراما)، ہریش چندر: طبع اول۔ ابو العلائی پریس آگرہ (ڈراما)، جوہر شمشیر: غیر مطبوعہ (ڈراما)، سرفروش: غیر مطبوعہ (ڈراما)، غیبی تلوار: غیر مطبوعہ (ڈراما)، ایکٹریس کی محبت: غیر مطبوعہ (ڈراما)، دوشیزۂ فرانس جون آف آرک۔ غیر مطبوعہ (ڈراما)، کلنگ: غیر مطبوعہ (ڈراما)، گیت کی جیت: غیر مطبوعہ (ڈراما)، گوتم بدھ: غیر مطبوعہ (ڈراما)، سیماب کے مختصر ڈرامے (غیر مطبوعہ)

لغت، انسائیکلو پیڈیا

تاج اللغات: غیر مطبوعہ (اردو مصادر کی نامکمل لغت) ادبی موتی: طبع اول۔ آگرہ اخبار برقی پریس آگرہ۔ 1936 (چار جلدوں میں تاریخ، طب، صحت، شخصیات، جغرافیہ وغیرہ پر مشتمل بچوں کا انسائیکلو پیڈیا)

خواتین اور بچوں کے لیے تعلیم و تربیت

اصول موتی۔ طبع اول۔ عزیزی پریس آگرہ، آفتاب اردو۔ طبع اول (نصاب تعلیم میں شامل کتاب)، بہشتِ شداد۔ طبع اول۔ ابو العلائی پریس آگرہ، جزاؤ کرن پھول: طبع اول۔ ابو العلائی پریس آگرہ، جزاؤ چمپا کلی: طبع اول۔ عزیزی پریس آگرہ، چڑے چڑیا کی کہانی: طبع اول۔ ابو العلائی پریس آگرہ، رومن کیریکٹر: طبع اول۔ ابو العلائی پریس آگرہ (رومن رسم الخط میں انگلش لکھنے کے طریقے)، زنانہ آداب: طبع اول۔ عزیزی پریس آگرہ، زنانہ بستہ: طبع اول۔ حکیم محمد یعقوب خاں دہلی (12 جلدوں پر مشتمل بچیوں اور عورتوں کی تعلیم و تربیت طبع دوم تا طبع ہشتم۔ عصمت بک ڈپو دہلی)، زنانہ خط و کتابت: طبع اول۔ ابو العلائی پریس آگرہ، زیورِ ایمان۔ طبع اوّل۔ ابو العلائی پریس آگرہ۔ سترہ کہانیاں۔ طبع اوّل۔ عزیزی پریس آگرہ۔ سردار ماں باپ کے دو سردار بیٹے: طبع اول۔ ابو العلائی پریس آگرہ، گلفشاں سہیلی: طبع اول۔ عزیزی پریس آگرہ، سولہ کہانیاں: طبع اول۔ عزیزی پریس آگرہ۔ لاڈلا بیٹا۔ طبع اوّل۔ عزیزی پریس آگرہ۔ معلمہ (بہشتی جھومر)۔ طبع اوّل۔ عزیزی پریس آگرہ 1916، مضمون نویسی (مضمون نگار) طبع اول۔ ابو العلائی پریس آگرہ، نیا باورچی خانہ: طبع اوّل۔ ابو العلائی پریس آگرہ

خود نوشت

شاعر کی راتیں: غیر مطبوعہ (مشاعروں کے دلچسپ واقعات جن میں خود شریک ہوئے)، شعر الحیات: غیر مطبوعہ (اپنے حالاتِ زندگی جن کو اولاً 'کلیم عجم' میں اختصار سے شائع کیا گیا)

دیگر

مشاہدات: طبع اول۔ مکتبہ قصر الادب آگرہ (بوہرہ اوقاف کا سروے)، سیماب کے سہرے: غیر مطبوعہ (شادی بیاہ کے مواقع پر لکھے گئے سہرے)، شذراتِ سیماب: غیر مطبوعہ (اخبار 'تاج' کے سیاسی اداریے)، میرے شاگرد: غیر مطبوعہ (دو جلدوں میں دیدہ و نادیدہ تلامذہ کے تذکرے)

itsurdu.blogspot.com

جہانِ دیگر

حضرتِ سیماب کی غزلوں اور اشعار کی بے پناہ مقبولیت کا ثبوت یہ ہے کہ ان کے کئی اشعار ضرب المثل ہو چکے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ کے ایل سہگل سے لے کر مہدی حسن، جگجیت سنگھ اور غلام فرید صابری تک نہ جانے کتنے گلوکاروں نے ان کا کلام گایا اور ریکارڈ کروایا ہے۔ اور بیشتر قوال صوفیانہ محفلوں میں ان کے کلام پر جذب کا سماں پیدا کر دیتے ہیں۔

اہم بات یہ ہے کہ حضرت سیماب کی شخصیت اور فن پر ریسرچ کا سلسلہ جاری ہے۔ سب سے پہلے ڈاکٹر افتخار احمد فخر دھولیوی نے اپنے مقالے 'سیماب اور دبستانِ سیماب' پر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ اس مقالے کی تفصیل مجھے نہیں مل سکی۔ ڈاکٹر زرینہ ثانی نے اپنے مقالے 'سیماب کی نظمیہ شاعری' پر 1969 میں ناگپور یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی۔ اس مقالے کی تلخیص کتابی صورت میں فروری 1978 میں سیماب اکادمی ممبئی نے شائع کی۔ اب حضرت سیماب کی شخصیت اور فن پر شمیمہ اختر، جموں یونیورسٹی سے اور فرحت زہرہ علی گڑھ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کر رہی ہیں۔

حضرت سیماب کے شاگرد راز چاند پوری نے ان کے فن اور شخصیت پر ایک مختصر کتاب 'داستانِ چند' لکھی تھی جسے مارچ 1968 میں نسیم بک ڈپو لکھنؤ نے شائع کیا۔ راز صاحب نے اپنے نام آئے 16 ادیبوں کے خطوط کا مجموعہ 'داستان عہد گل' مرتب کیا تھا جس میں حضرت سیماب کے کئی خطوط ہیں، اس کتاب کو بھی نسیم بک ڈپو لکھنؤ نے مئی 1971 میں شائع کیا۔ حضرت سیماب کے شاگرد مہر لال سونی ضیا فتح آبادی نے ان کی شخصیت پر ایک کتاب 'ذکرِ سیماب' لکھی نیز خطوط کا مجموعہ 'سیماب بنام ضیا' جگدیش بھٹناگر حیات نے مرتب کیا ان دونوں کو بزم سیماب دہلی نے علی الترتیب جنوری 1984 اور اپریل 1981 میں شائع کیا۔

میرے علم میں چند غیر مطبوعہ مقالے بھی آئے ہیں جنھیں کتابی صورت میں شائع کرنا

ضروری ہے جن میں تاجدار احتشام صدیقی کی مختصر کتاب 'میرے دادا جان' شارق جمال کی 'غزلیاتِ سیماب کا عروضی تجزیہ' ساحل احمد کی 'تلامذہ سیماب اور چاند میاں طیب کی' تلامذۂ سیماب' قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ افتخار امام صدیقی کا طویل مضمون 'آگرہ اسکول' ماہنامہ شاعر کے ہم عصر اردو ادب نمبر 98-1997 میں شائع ہوا تھا اب وہ اسے مزید اضافوں کے ساتھ کتابی روپ دے رہے ہیں۔ راقم الحروف نے بھی 'انتخاب غزلیاتِ سیماب' مرتب کیا ہے جس کے ساتھ ایک طویل مضمون بھی ہے پتہ نہیں یہ سب کب شائع ہو سکے گا۔

حضرت سیماب کی زندگی میں ہی ماہنامہ شاعر نے آگرہ سے کارِ امروز نمبر اور آگرہ اسکول نمبر شائع کیے تھے نیز ماہنامہ الوارث ممبئی نے جنوری فروری 1949 میں سیماب نمبر شائع کیا تھا۔ ان کی وفات کے بعد پرچم کراچی نے تعزیت نمبر اور احسن رام پور نے مئی 1951 میں سیماب نمبر شائع کیا۔ ماہنامہ کندن کراچی نے فروری 1993 میں سیماب نمبر شائع کیا۔ دہلی سے ضیا فتح آبادی ماہنامہ سیماب نکالتے تھے۔

ممبئی میں اعجاز صدیقی کی رہنمائی اور کرشن چندر کی صدارت میں 1976 میں سیماب اکادمی ممبئی قائم ہوئی تھی جس کے افتتاحی جلسے میں محمد رفیع اور دیگر فنکاروں نے غزلیاتِ سیماب پیش کی تھیں۔ کراچی میں مظہر صدیقی کی مساعی جمیلہ سے سیماب اکادمی قائم ہوئی جس نے قلیل مدت میں اشاعت اور تقریبات کے ذریعہ بہت کام کیا۔ یہ دونوں اکادمیاں دونوں فرزندانِ سیماب کے ساتھ ہی فوت ہو گئیں۔ کئی شہروں میں بزمِ سیماب اور سیماب لٹریری سوسائٹی کے قیام کے شواہد بھی ملتے ہیں۔

حضرت سیماب کا مزار کراچی میں محمد علی جناح کے مزار کے وسیع احاطے میں ہے، لہٰذا فوجی حکومت کی قائد اعظم مزار مینجمنٹ بورڈ نے اسے مسمار کروا دیا۔ اب شاید صرف لوحِ مزار باقی ہے۔

○

itsurdu.blogspot.com

انتخاب غزلیات

کلیم عجم

گہرائیوں میں روح کی عالم ہے نور کا
آنکھوں کو اپنی چوم لوں امکان ہو اگر

فطرتاً ہوگئے تبدیل وہ آدابِ جنوں
فکر و خیال و ذہن کی پرواز ہے بلند

الہام کیوں نہ ہو دمِ فکرِ سخن مجھے
سیماب اپنا عکس بھی آتا نہیں نظر

اک کھلونا ہے مرا خاکی بدن
ڈرتا ہوں اور پھر نہیں ڈرتا گناہ سے

قیامت تک اڑے گی دل سے اٹھ کر خاک آنکھوں تک
یونہی ہم تم گھڑی بھر کو ملا کرتے تو بہتر تھا

عمر دراز، مانگ کے لائی تھی چار دن
ایک چھوٹا سا نشیمن تو بنا لیتا میں

صبر و شکیب بھی تھے دل بے خبر کے ساتھ
ہیں وہی یا رب مرے لیل و نہار

یہ حکم کیا کہ جو مانگے گا پائے گا سائل
تیرگی قسمت کی، تاریکی ہجوم یاس کی

جو تھا برتاؤ دنیا کا وہی اس نے کیا مجھ سے
شاید یہ وقت خاص ہے تیرے ظہور کا

ان میں مزہ بھرا ہے تو تیرے انتظار کا
چاک ہونا نہیں اب فرض گریبانوں کا

اڑتے ہیں بامِ عرش پہ یہ طائرانِ غیب
سیماب ہے زبان مری ترجمانِ غیب

یہ کون آئینے میں مرے جلوہ گر ہے آج
اک تماشا ہے مرے پیکر میں روح

آتی ہے اور پھر نہیں آتی خدا کی یاد
اسی رستے گیا ہے حسرتوں کا قافلہ ہو کر

یہ دونوں وقت جیسے روز ملتے ہیں جدا ہو کر
دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں

چار تنکے نہ دیے میرے خدا نے مجھ کو
گھر والوں کو بھی لوٹ لیا تم نے گھر کے ساتھ

فائدہ کیا گردشِ ایام سے
تمھیں نہ مانگ لے، سائل کی تم نے خوب کہی

یہ اندھیرے بھی شریکِ شامِ ہجراں ہوگئے
میں دنیا سے انوکھا تھا کہ وہ کرتا وفا مجھ سے

مرے پہلو میں دل رکھ کر مجھے قسمت نے لٹوایا
میں دیوانہ ہوں میرے پاس محشر میں کھڑے رہنا

تو کیا اپنی سزائے قتل پر خود دستخط کر دوں
جدھر دیکھتا ہوں نظر آ رہی ہے

شبِ ہجر بستر پہ تنہا نہیں ہوں
آجاتی ہے کچھ یاد تو بھر آتے ہیں آنسو

دل کے بہلانے کا وحشت میں ہو ساماں کوئی
آدابِ وصل معلوم! اب میں کہاں تمھیں ہو

باہر آتی نہیں رہ رہ کے کھنک جاتی ہے
وہ جانتا ہے میں پابندِ رسم و راہ نہیں

لے چلی وحشی بنا کر فتنہ سامانی مجھے
موسمِ وحشت میں عالمگیر ہے دیوانگی

آگاہِ راز آنکھیں یہ بھید جانتی ہیں
فکرِ سیماب، ہے انجامِ دعا کی ناحق

قصور ہی پہ کرم کی اساس ہے سیماب
منہ زرد، خونِ یاس سے پلکیں بھری ہوئی

مذاقِ درد پسندی مرا شعار ہوا
خاک سے پا کے نمو، خاک میں پنہاں ہونا

کھول دیں عبرتِ انجام نے آنکھیں سیماب
تحصیل یہ ہے میری حیات اور موت کی

تسکینِ محبت کے یہ دو ہی طریقے تھے
کاروانِ غم کا مقصودِ نظر اچھا رہا

ہوئی محسوس صبحِ حشر یہ تعبیر دنیا کی
نہ میرے پاس دل ہوتا نہ کوئی مانگتا مجھ سے

نہ جانے میں کہوں کیا اور کیا پوچھے خدا مجھ سے
وہ لکھواتے ہیں کیوں جرمِ وفا کا فیصلہ مجھ سے

تری شکل حدِ نظر بن گئی ہے
مرے ساتھ تقدیر بھی سو رہی ہے

ہم سے تو مصیبت میں دعا بھی نہیں ہوتی
لا کے رکھ جائے مرے گھر میں بیاباں کوئی

کھویا گیا ہوں حدِ جذبات سے گزر کے
دل میں لٹی ہوئی اک پھانس ہے حسرت کیا ہے

فضول ٹھوکریں کھانے کو راہبر آئے
حشر تک ڈھونڈا کرے اب خانہ ویرانی مجھے

ساری دنیا اب نظر آتی ہے دیوانی مجھے
پنہاں کچھ اور بھی ہے پردے میں آدمی کے

دل سے نکلی تو ہم آغوشِ اثر بھی ہوگی
قصور اگر نہ کیا تو قصور تو نے کیا

عالم تو دیکھیے سحرِ انتظار کا
میں بے قرار نہ ہونے سے بے قرار ہوا

سچ تو یہ ہے کہ عجب کھیل ہے انساں ہونا
میں سمجھتا تھا بڑی چیز ہے انساں ہونا

مٹی کا ایک نقش بنایا مٹا دیا
یا تم نہ بنے ہوتے یا دل نہ بنا ہوتا

مختصر سا، دل سے آنکھوں تک سفر اچھا رہا
کہ ہم اک رات جاگے تھے کسی خوابِ پریشاں میں

itsurdu.blogspot.com

تری پہچان آساں ہے اگر پہچان ہو اپنی
ہو ناگوار جسے زندگی وہ مر جائے
زندگی کی مہلتیں معلوم ہیں
لطف تو جب ہے کہ ہو تجھ کو تمنا دید کی
وہ کیوں آئے فریب ابتدا میں
لب رنگین و چشم کیف انگیز
دل کو اس کی یاد سے آباد رکھ
ہر سلسلۂ وحشت مربوط و مسلسل تھا
ترجمانِ صد سکوں تھا تیرا اندازِ سکوت
یہ کس نے شاخ گل لا کر قریب آشیاں رکھ دی
خلوصِ دل سے جو سجدہ ہو اس سجدے کا کیا کہنا
فنا دراصل ہے جذبات کا افسردہ ہو جانا
میری نظر سے تم مجھے دیکھو تو لطف ہے
قصرِ کسریٰ، چترِ دارا، تختِ نادر، بزمِ جم
ہم ملے تھے ایک دن سیماب سے یادش بخیر
غم مجھے، حسرت مجھے، وحشت مجھے، سودا مجھے
ہے حصولِ آرزو کا راز ترکِ آرزو
دیکھتے ہی دیکھتے دنیا سے میں اٹھ جاؤں گا
منزل ملی، مراد ملی، مدعا ملا
پایا تجھے حدودِ تعین سے ماورا
جب تصور نے بڑھا دی نالۂ موزوں کے لے
اللہ رے شامِ غم مرے دل کی شکستگی
کیا دیتے ہم کسی کو دعائے سلامتی

مصیبت تو یہ ہے اپنے لیے میں آپ مشکل ہوں
وہ کیا کرے جسے مرنا بھی خوشگوار نہیں
مجھ کو مرنے کی تو فرصت ہی نہیں
اور تیری طرح کوئی دوسرا پردے میں ہو
جسے معلوم اپنی انتہا ہو
اسی عنوان سے تم میکدا ہو
بھولنا اچھا نہیں ہے یاد رکھ
زنجیر سے پیوستہ زنجیر نظر آئی
جانے کیا کچھ کہہ گئیں خاموشیاں تصویر کی
کہ میں نے شوقِ گل بوسی میں کانٹوں پر زباں رکھ دی
وہیں کعبہ سرک آیا جبیں ہم نے جہاں رکھ دی
نہ میرا عشق فانی ہے، نہ تیرا حسن فانی ہے
کچھ دیر کو نگاہ بدل لو نگاہ سے
ہائے وہ عالم کہ جو زیرِ زمیں روپوش ہے
آدمی خوش فکر ہے، خوش وضع ہے، خوش پوش ہے
ایک دل دے کر خدا نے دے دیا کیا کیا مجھے
میں نے دنیا چھوڑ دی تو مل گئی دنیا مجھے
دیکھتی کی دیکھتی رہ جائے گی دنیا مجھے
سب کچھ مجھے ملا جو ترا نقشِ پا ملا
منزل سے کچھ نکل کے ترا راستا ملا
ساز بے آواز سے اک شعر پیدا ہو گیا
تاروں کا ٹوٹنا بھی مجھے ناگوار تھا
اپنی ہی زندگی کا کسے اعتبار تھا

واقعاتِ عشق کا تھا لمحہ لمحہ اک صدی
ہزار رنگ کے پردوں میں چھپ کے پھیل گئے
نہ تھا وہ بھید کہ دنیا مجھے سمجھ لیتی
پُر شور گھٹاؤں کا ممنون نہ ہونے دو
ایسا نہ ہو یہ دنیا پھر ہوش میں لے آئے
خود قصۂ غم اپنا کوتاہ کیا میں نے
تمھیں تو حدِ نظر تک ورود آساں تھا
میں نے اس خوابیدہ عالم کو بنایا کام کا
اس کی ہستی وہم، مستی وہم اور پستی بھی وہم
ہے فریبِ طولِ عشرت، محفلِ ہستی کی شام
پہلے اے سیماب اس دنیا میں ملتا تھا خدا
تعینات کے پردوں میں چھپ کے بیٹھ گئے
وفا کی سطح سے گزری ہوئی ملی دنیا
سرائے دہر میں سیماب دل لگا نہ سکا
اسے معلوم تو ہے میری پریشاں خوابی
نیا حاصل ہماری سعیِ لاحاصل سے نکلے گا
ختمِ ہستی پہ ہے ادراکِ حقیقت موقوف
اگر تو چاہتا ہے آرزو تیری کرے دنیا
فضا میں کھو کے رہ جاتی ہیں ہشیاروں کی فریادیں
ہستی و نیستی کی حدیں دور رہ گئیں
نازک سا امتیاز رہا جانبین میں
غالباً فطرتِ دنیا ہی پریشانی تھی
ڈھونڈتا پھرتا تھا چشمِ آرزو کی روشنی

ہر نفس میں میں نے اک رومان پورا کر دیا
یہ اک ظہور کی ترکیب تھی، حجاب نہ تھا
میں خود بھی اپنے سمجھنے میں کامیاب نہ تھا
تم کو بھی تو آتا ہے دیوانہ بنا دینا
دیوانے کی فطرت کو دیوانہ بنا دینا
دنیا نے بہت چاہا افسانہ بنا دینا
اگر بلند میں اپنی نگاہ کر نہ سکا
گرمیِ محفلِ نتیجہ ہے مرے پیغام کا
نام ہے انسان، اک مجموعۂ اوہام کا
صبح ہونے تک ہے وقفہ گردشِ یک جام کا
اب تو ٹکڑا بھی نہیں ملتا خدا کے نام کا
حجاب کا یہ انھیں اور اک بہانہ ملا
غرض کے رنگ میں ڈوبا ہوا زمانہ ملا
سفر کی بات تھی، سب سے مسافرانہ ملا
کیوں مرے خواب میں آ کر وہ پریشاں ہوتا
نہ نکلا کام جو ماضی سے مستقبل سے نکلے گا
اور اگر ختم یہ ہنگامۂ باطل نہ ہوا
تو دل پر جبر کر کے بے نیازِ آرزو ہو جا
طوافِ عرش کرنا ہے تو دیوانے کی ہُو ہو جا
یہ آ گیا کہاں میں تجھے ڈھونڈتا ہوا
جو رنگ تھا خودی کا وہی بے خودی کا تھا
جسے دیکھا اسے دنیا میں پریشاں دیکھا
میں شبِ فرقت اندھیری رات کا پرواں نہ تھا

itsurdu.blogspot.com

رات دن سیماب میں دنیا میں سرگرداں رہا
ایوانِ تصور سے اپنے نکلا نہ طلب کی دنیا میں

بزمِ عالم کو فرصتِ انجام
زندگی جس میں سانس لیتی تھی
پھر ذرا ماہ و کواکب کا تکلم دیکھیے
غور کر کے دیکھ کیا تھا اور کیا ہو جائے گا

محبت میں اک ایسا وقت بھی آتا ہے انساں پر
اسی سے روشنی پھیلی بساطِ بزمِ امکاں پر

نظامِ جزر و مد میں ہر نفس کی آمد و شد سے
یہ تصویر اڑ کے جانے ہی نہ پائے چشمِ عرفاں سے

الٰہی بھید تیرے اس نے ظاہر کر دیے سب پر
تو نہیں تو رات ہے محرومِ سوزِ زندگی

زندگی تجھ سے عبارت تھی مگر جب تو نہیں
بندگی نے ہزار رخ بدلے

دل میں تجھ کو چھپائے پھرتا ہوں
بڑے تاریک، لمبے اور پیچیدہ دوراہے ہیں

کھلے تو ہوئے رنگِ کثرت کے مظہر
کتابِ محبت کا حرفِ غلط میں

دفعتاً سازِ دو عالم بے صدا ہو جائے گا
جب ہمیں دیوانہ بننا ہے تو کیسی مصلحت

نہ ابتدا ہوں کسی کی نہ انتہا ہوں میں
فطرتِ حسن سے کہو، اور کلیم بھیج دے

کامیابی کوئی ممکن غم دوراں میں نہیں
پاؤں کا چکر جوابِ گردشِ پیمانہ تھا

جب تک ہر ذرے کو میں نے پھیلا کر دنیا کر نہ دیا
میری نیت میں انقلاب ہے آج

وہ زمانہ خیال و خواب ہے آج
کیجیے خاموش ہو کر گفتگو میری طرح

آدمی بننے سے پہلے، رائیگاں ہونے کے بعد
ستاروں کی چمک سے چوٹ لگتی ہے رگِ جاں پر

محبت اک بڑا احسان ہے تاریخِ انساں پر
نئے ساحل کیے ہیں میں نے قائم موجِ طوفاں پر

جہاں اس کا تصور ہے وہیں ایمان پیدا کر
کہا تھا کس نے تو سیماب کو انسان پیدا کر

شام ہی سے چاندنی روپوش ہے تیرے بغیر
زندگی کا اپنی کس کو ہوش ہے تیرے بغیر

جو خدا تھا وہی خدا ہے ہنوز
جیسے تو میرا مدعا ہے ہنوز

تری زلفِ پریشاں سے، مرے قلبِ پریشاں تک
چھپے تو ہوئے لامکاں کے مکیں تم

نگاہِ عقیدت کا حق الیقیں تم
کہتے کہتے رک گئے جس دن ترا افسانہ ہم

مصلحت کو بھی بنا لیں گے ترا دیوانہ ہم
بس ایک خوابِ سحر نا تمام سا ہوں میں

خامشی ناگوار ہے انجمنِ نیاز میں
مجھے دھوکا ہے کہ میں عالمِ امکاں میں نہیں

تو اپنا غم عنایت کر، کہ ہنگامہ ترے غم کا
ذرا کھل کر پکارا اے صورِ مجذوبانِ الفت کو

لذتِ ایذا سے خوش ہے خاطرِ ایذا پسند
شبِ غم اے تصور ان کو مجبورِ تبسم کر

اور بھی ذہنِ تصور میں ہیں نقشے محفوظ
یہ تیری جستجو کا انجام سوچتا ہوں

کی اپنے ڈھونڈنے کی تحریک بھی مجھی سے
معمورۂ فنا کی کوتاہیاں تو دیکھو

ہے مری تخلیق تعمیلِ تمنا ہائے "کن"
صرف ہوں گی حشر تک روحیں مری تکمیل میں

سیماب ہم میں عیب و ہنر خود ہیں بے حساب
صحرا سے بار بار وطن کون جائے گا

سمجھ حقیر نہ ان زندگی کے لمحوں کو
میں نے کچھ گرہیں لگا رکھی تھیں دل میں ضبط کی

میں نے جن ایمنوں پر آزادی کی رکھی تھی اساس
اپنی دھن میں عشق نکلا صد تباہی در نگاہ

نہ پوچھیے مری ہم رنگی و ہمہ رنگی
شریکِ سہو و خطا ہے سرشت میں میری

دل کی بساط کیا تھی نگاہِ جمال میں
تنگ آ کے توڑتا ہوں طلسمِ خیال کو

دنیا ہے خواب، حاصلِ دنیا خیال ہے
تجھے کر لیتے ہیں یوں اپنی مصیبت میں شریک

یہ دنیا اگر میرے قابل نہیں ہے
سما سکتا نہیں تو گونج سکتا ہے رگِ جاں میں

یہ دیوانے کہیں بیٹھے نہ رہ جائیں بیاباں میں
میں وہ مضطر ہوں کہ محتاجِ سکونِ دل نہیں

مرتب اس اجالے میں ہم اپنی داستاں کر لیں
خوبصورت ہو، مگر حاصل ایجاد نہیں

میں جستجو سے تھک کر کھو جاؤں گا تجھی میں
پھر یہ ستم ظریفی، وہ آ چھپا مجھی میں

اک موت کا بھی دن ہے دو دن کی زندگی میں
میری فطرت ہے تمنا، میں تمنا زاد ہوں

میں تو نقشِ ناتمام عالمِ ایجاد ہوں
ہم کیا کسی کے عیب و ہنر پر نظر کریں

کیوں اے جنوں نہیں نہ اٹھا لاؤں گھر کو میں
ارے انھیں سے زمانے بنائے جاتے ہیں

وہ بھی صرفِ بخیۂ چاک گریباں ہو گئیں
میری قسمت سے وہی بنیادِ زنداں ہو گئیں

جو زمینیں سامنے آئیں بیاباں ہو گئیں
جو کچھ سمجھ لیا جس نے مجھے، وہی ہوں میں

ہے اعتراف کہ سیماب آدمی ہوں میں
اک آئینہ تھا ٹوٹ گیا دیکھ بھال میں

یا مطمئن کرو کہ تمھیں ہو خیال میں
انسان خواب دیکھ رہا ہے خیال میں

تیری تصویر پہ کچھ اشک گرا لیتے ہیں
ترے پاس یا رب جہاں اور بھی ہیں

itsurdu.blogspot.com

موج اندر موج بادہ، مختصر مینائے شوق
زندگی دو دن کی اس پر یہ جہاں ایجادیاں
حقیر ہوں، مگر اتنا حقیر بھی نہ سمجھ
یہ مقدرات عجیب ہیں، یہ تباہیاں ازلی سی ہیں
ترے انتظار میں زندگی، ہوئی ختم شام سے صبح تک
فضا پہ چھائی ہوئی موت کی اداسی تھی
میں بعد مرگ بھی بزم وفا میں زندہ ہوں
یہی اگر شرط گفتگو ہے تو ہم سے بھی کیوں نہ گفتگو ہو
مراسم کی کڑی، قیدِ علائق، مجلسِ ہستی
ہستیِ انساں، بڑی صنعت کی اک تعمیر تھی
مجھ کو اس دنیا سے کوئی کھونے والا تھا ضرور
اڑ رہے ہیں گردِ بربادی میں کچھ اوراق دل
وہ آئینہ ہو یا ہو پھول، تارا ہو کہ پیمانہ
شکستہ ہر کڑی ہے، ہر کڑی میں دل کے ٹکڑے ہیں
ہر ہر قدم پہ حائل ہے راہ و رسم منزل
محوِ حیرتِ تصور صورت بدل رہی ہے
جوشِ غم، ہنگامۂ حسرت، ہجوم آرزو
نظر صرفِ حقیقت ہو رہی ہے
پہلے خیال، خواب سے تھا طالب سکوں
چھوڑ آئی لامکاں کو بھی پیچھے تری تلاش
خراب فردِ عمل ہو نہ جائے اے سیماب
آشنائی اک ادا ہے جو کسی میں بھی نہیں
مختلف ہیولوں میں اک مری تمنا تھی

ہر نفس سے، ہر نظر سے ایک دل پیدا کریں
اہتمام اتنا کریں سیماب، اور پھر کیا کریں
میں ذرہ بھی تو نہیں ہوں جو آفتاب نہیں
کہ ترے شباب کے ساتھ ہی مری عمرِ عشق دراز ہو
نہ فریب دے مجھے آرزو، نہ یہ رات اتنی دراز ہو
یہ ابتدا تھی، اب انجام انتظار، نہ پوچھ
تلاش کر مری محفل، مرا مزار نہ پوچھ
ہمیں بھی مثلِ کلیم تم سے مجال عرضِ سخن نہیں ہے
بڑی دشواریوں سے آدمی آزاد ہوتا ہے
اور اس تصویر کے پردے میں اک تصویر تھی
یہ نہیں معلوم تم تھے یا مری تقدیر تھی
ان میں وہ صفحہ نہ ہو جس پر تری تصویر تھی
کہیں جو کچھ بھی ٹوٹا میں یہی سمجھا مرا دل ہے
بڑی عبرت سے دیوانے مری زنجیر دیکھیں گے
میں اور کھو گیا ہوں تقلیدِ راہبر سے
تصویر بن گیا ہوں تخیل کے اثر سے
آپ کیا دل میں ہیں، اک دنیا کی دنیا دل میں ہے
مجھے دنیا سے نفرت ہو رہی ہے
اب خواب ڈھونڈتا ہے پناہیں خیال کی
اپنی حدوں سے بڑھ گئی وسعت خیال کی
اے جنابِ رسالت مآبؐ دیکھیں گے
بے وفائی اک وبا ہے، اور عالمگیر ہے
چھپ گئی تو عقبیٰ تھی، مل گئی تو دنیا تھی

دیدہ زیب تھی دنیا، قابل تماشا تھی
فطرتِ طلب معلوم، ہاں مگر یہ دیکھا ہے
سیماب لفظ لفظ اترتا ہے عرش سے
ایواں یہ بنانا ہے، وہ قصر سجانا ہے
مٹنے والوں کا ہیولا پھر نہ قائم ہو سکا
نہیں ملتا اگر اب آشیاں اے خانہ ویرانی
میں اس دنیا میں اے سیماب اک رازِ حقیقت تھا
کہانی ہے تو اتنی ہے فریبِ خوابِ ہستی کی
کہانی میری روداد جہاں معلوم ہوتی ہے
چمن کے سائے کو مدتیں گزریں مگر اب بھی
ہوائے شوق کی قوت وہاں لے آئی ہے مجھ کو
ترقی پر ہے روز افزوں خلش دردِ محبت کی
قفس کی تیلیوں میں جانے کیا ترکیب رکھی ہے
تھی مشیت ہی خلافِ عشق ورنہ خلقتاً
نہ ہونا ہی مرا اک فلسفہ ہے تیرے ہونے کا
دنیا کہ ایک شعبدۂ اعتبار ہے
آزردۂ خزاں سے یہ کہہ دو کہ شامِ غم
کہہ دو کہ بہار آئے تو بے کار نہ بیٹھے
دیوانگیٔ عشق بڑی چیز ہے سیماب
یہ سب کون و مکاں میرے، بساطِ لامکاں میری
ہر اک ذرہ ہے صحرا اور ہر صحرا ہے اک دنیا
یا نہ تھی سیماب دنیا فطرتاً ہستی شناس
ہم تو اپنی بے خودیِ شوق میں سرشار تھے

دل اگر نہ مر جاتا، زندگی بری کیا تھی
جس نے چھوڑ دی دنیا، اس کے ساتھ دنیا تھی
میری بیاضِ شعر خدا کی کتاب ہے
جیسے ہمیں دنیا میں پھر لوٹ کر آنا ہے
ایک اک ذرے کو صدیوں آسماں دیکھا کیے
تو ایسا ذہن لاوے جو قفس کو آشیاں سمجھے
سمجھنے کی طرح اہلِ جہاں مجھ کو کہاں سمجھے
کہ آنکھیں بند ہوں اور آدمی افسانہ ہو جائے
جو سنتا ہے اسی کی داستاں معلوم ہوتی ہے
چمکتی ہے جو بجلی آشیاں معلوم ہوتی ہے
جہاں منزل بھی گردِ کارواں معلوم ہوتی ہے
جہاں محسوس ہوتی تھی وہاں معلوم ہوتی ہے
کہ ہر بجلی قریبِ آشیاں معلوم ہوتی ہے
آسماں کو داغِ دل ملتا، مہِ کامل مجھے
تری ہستی کہاں، گر میری ہستی میری ہستی ہے
خوابِ تعینات سرابِ بہار ہے
دیباچۂ فسانۂ صبحِ بہار ہے
دیوانہ بنے یا مجھے دیوانہ بنا دے
یہ اس کا کرم ہے جسے دیوانہ بنا دے
ہیولا ہے یہاں میرا، حقیقت ہے وہاں میری
مگر اس وسعتِ عالم میں گنجائش کہاں میری
یا مری ہستی ہی دنیا میں کسی قابل نہ تھی
آپ سے کس نے کہا تھا خود نما ہو جائیے

itsurdu.blogspot.com

قید و آزادی مری پرواز کے دو کھیل ہیں
سب چاہتے ہیں بزمِ جہاں میں نشاں رہے

کچھ وقت کٹ گیا تھا تری یاد کے بغیر
اک سکوں کیا اور بھی کچھ نعمتیں مل جائیں گی

رفعتوں کی ہیں فضاؤں میں بہت گنجائشیں
زندگی اور موت، دو آویزشیں ہیں عارضی

یہ کھیلے ہے کوئی دیوانہ دنیا میں اداس
دو جہاں ترکِ محبت میں کیے تیرے لیے

سرائے دہر میں سیماب جاگنا ہے مناسب
دنیا سے اک افسانہ کہنے کو تھے، پھر سوچا

نگاہ و ذہن ہے احساس کائنات سے خالی
بھاری قدم، نظر متحیر، نفس دراز

جدا نہ کر مجھے نظروں سے میں نہ کہتا تھا
صدائے صور سے میں قبر میں نہ جاؤں گا

نشاطِ بزمِ عالم زندگی کے کیف و کم تک ہے
نوشِ حیات و نیشِ غم، ایک دل اور دو ستم

سدرۃ المنتہیٰ

خوشی پر مری دنیا میں شورش ہے قیامت کی
مجھے مرنا نہیں آتا مجھے سیماب کہتے ہیں

میں اپنا راز خود کہہ کر نہ کیوں خاموش ہو جاؤں
خود اپنے حال میں بے ضابطہ تبدیلیاں کر لیں

حرم اور دیر کے کہتے وہ دیکھے جس کو فرصت ہے
اک قفس اس پر میں ہے، ایک آشیاں اس پر میں ہے

یہ ہو تو بے نشانی عالم کہاں رہے
ہم پر تمام عمر وہ لمحے گراں رہے

تا بہ امکاں سیرِ جلوہ زارِ امکاں کیجیے
اک نئی انگڑائی لے کر آسماں ہو جائیے

ہر تعین سے گزر کر جاوداں ہو جائیے
بے سبب جب، بزمِ عالم کو پریشاں دیکھیے

اور بیزار جو تجھ سے بھی مرا دل ہو جائے
مسافروں کو یہاں خواب سازگار نہیں ہے

دنیا ہے خود افسانہ، افسانے سے کیا کہیے
عجیب چیز ترا انتظار میرے لیے ہے

کیا ہم حدودِ کوچۂ جاناں میں آ گئے
اب انتظار تجھے ہے کہ انتظار مجھے

کسی سنی ہوئی آواز سے پکار مجھے
یہ ساز اور اس کا ہر نغمہ نفس کے زیر و بم تک ہے

لذتِ غم ہی کر عطا لذتِ زندگی نہ دے
خدا ناخواستہ لب کھل گئے ہوتے تو کیا ہوتا

جو برزخ بھی بدل جاتا تو میرا کیمیا ہوتا
بدل جاتی ہے دنیا، اعتبارِ راز داں کب تک

میں کرتا انتظار انقلاب آسماں کب تک
یہاں حد نظر تک صرف عنوانِ محبت ہے

پرستارِ محبت کی محبت ہی شریعت ہے
نازک سی شگفتہ سی آواز اک آئی تھی

حاصلِ جوشِ جنوں ویرانیِ تخیل ہے
روح اک موجِ تجلی، جسم ہے اک مشتِ خاک

پسِ ہر رہ گزر اک رہ گزر معلوم ہوتی ہے
قضا برحق، مگر دلچسپیاں ہستی کی اتنی ہیں

دماغ و روح یکساں چاہئیں انسانِ کامل میں
غزل ہی کہہ لی سنانے کو حشر میں سیماب

فقط احساسِ آزادی سے آزادی عبارت ہے
اے دستِ جنوں، کون کفن دشت میں دے گا

ایثار میرا دیکھ مرے عجز پہ نہ جا
میں تنہا آبِ و رنگِ بزمِ امکاں ہو نہیں سکتا

دعا جائز، خدا برحق، مگر مانگوں تو کیا مانگوں
آنکھوں نے، دل نے، روح نے، وہم و خیال نے

نہ جانے کون ہے گمراہ، کون آگاہِ منزل ہے
بڑھا لیتے ہیں خود دشواریاں منزل کی گن گن کر

کب تک یونہی رہے گا غم دل کا سلسلہ
رہے تو عالمِ ہستی میں دیر تک سیماب

تاج میں کھل کے چاندنی مجھ سے یہ راز کہہ گئی
مری کیا انتہا ہو جب نہیں ہے ابتدا کوئی

شفق نے شام کے بھیگے ہوئے بادل پہ کیا لکھا
محبت آج کل کی غیر آئینی محبت ہے

لالہ و برگ و گیاہ، انجم و خورشید و ماہ
کسی کو یاد کر کے آہ کر لینا عبادت ہے

کیا تم نے مجھے دل کے پردے سے پکارا تھا
میں جہاں جاؤں گا میرے ساتھ ٹھہرا جائے گا

آدمی بے چارہ کیا رہ جائے گا، کیا جائے گا
یہ دنیا تا بہ دنیائے دگر معلوم ہوتی ہے

کہ عمرِ خضر بھی تو مختصر معلوم ہوتی ہے
یہ کیا تقسیمِ ناقص ہے، خودی سر میں خدا دل میں

پڑے پڑے یونہی تنہا لحد میں کیا کرتے
وہی دیوار گھر کی ہے وہی دیوار زنداں کی

یہ رشتۂ دامان و گریباں کوئی دن اور
شاخِ خمیدہ ہوں شجرِ سایہ دار کی

یہ دل واپس، اگر تو اس میں مہماں ہو نہیں سکتا
سمجھتا ہوں کہ میں دنیا بداماں ہو نہیں سکتا

تقسیم کر لیا ہے تری جلوہ گاہ کو
ہزاروں کارواں ہیں زندگی کی شاہراہوں میں

قدم اٹھنے سے پہلے، میلِ منزل دیکھنے والے
اک روز سن کے، ختم یہ افسانہ کیجیے

مگر ملال رہا یہ کہ مستعار رہے
ماہِ تمام اور ہے، حسنِ تمام اور ہے

میں تھا موجود ارادوں میں کسی کے جب نہ تھا کوئی
فسانہ پھر مجھے بھولا ہوا یاد آ گیا کوئی

نہ معیارِ وفا کوئی، نہ معیارِ جفا کوئی
منزلِ مقصود تک سیکڑوں ہیں سنگِ راہ

itsurdu.blogspot.com

کچھ یوں بھی ہے کہ فطرتِ غم ہے سکوں پسند
چھوتی نہیں مجھے پرِ جبرئیل کی ہوا
مرکز پہ اپنے دھوپ سمٹتی ہے جس طرح
منظور ہے مجھے کششِ حسن سے شکست
ہے حسن اک جھلک مرے عشق تمام کی
تحلیل ہو رہی ہے مری روح ہر نفس
سیماب کس نے عرش سے آواز دی مجھے
میں صور کی آواز سے کیوں قبر میں جاگوں
سیماب کہاں ہوں میں، کریں غور نہ اس پر
اک محشرِ جمود ہے ہندوستاں مجھے
وسعت خاطرِ سلامت، ذوقِ آزادیِ بخیر!
حسن کا اظہار تھا سعیِ نظر پر منحصر
میں کیوں صبحِ ازل سے قصد کرتا شامِ ہستی کا
مری بلا سے زمانہ جو ساز گار نہیں
پہلے جسم و روح و دل سب مطلع الانوار تھے
عارضی حد بندیاں ہیں، دیس کیا پردیس کیا
میں براہِ راست سیاحِ فضائے عرش ہوں
خاکِ پروانہ، رگِ گل، عرقِ شبنم سے
بہت محتاط رہ کر لطف اٹھائے عمرِ فانی کے
طے خواب کے عالم میں ہوا راستہ سارا
گراں سمجھ کے جسے سب نے یہ کہاں کہ نہیں
نہ مدعیِ زمانہ ہو، میں نہ کہتا تھا!
ہنوز راز میں ہے ابتدا کی غایت بھی

کچھ یہ بھی ہے کہ ضبط کیے جا رہا ہوں میں
یہ کن بلندیوں پہ اڑا جا رہا ہوں میں
یوں رفتہ رفتہ تیرے قریب آ رہا ہوں میں
لے آج تجھ میں جذب ہوا جا رہا ہوں میں
اپنی ہی اک ادا پہ مٹا جا رہا ہوں میں
تعمیرِ کائنات میں کام آ رہا ہوں میں
کہہ دو کہ انتظار کرے، آ رہا ہوں میں
یہ تیرے لب ناز کی آواز کہاں ہے
احباب پہ دیکھیں مری آواز کہاں ہے
شاعر بنا کے پھینک دیا ہے کہاں مجھے
جب قفس کو میں نے پھیلایا گلستاں ہو گیا
میں نے جب چاہا جہاں چاہا نمایاں ہو گیا
نہ تھا معلوم اتنا وقت ہوگا رائیگاں میرا
یہ شکر ہے کہ زمانے کو سازگار ہوں میں
اور اب یہ حال ہے بابا، نہ تن اجلا نہ من
میں ہوں انساں وسعتِ کونین ہے میرا وطن
شہپرِ جبرئیل سے بالا ہے پروازِ سخن
اس نے ترکیب تو سوچی تھی مگر دل نہ بنا
ذرا سی زندگی جی کھول کر برباد کیا کرتے
کتنا طرب انگیز تھا افسانۂ منزل
دو بار دوش پہ میں نے اٹھا لیا کہ نہیں
زمانہ اب ہے ترے حسبِ مدعا کہ نہیں
ابھی سے کون پریشاں ہو انتہا کے لیے

فنا تک اہلِ عالم کی نگاہیں کب پہنچتی ہیں
یہ ہے پاسِ عبودیت کہ ہوں تقدیر پر شاکر
یہ دنیائے مجاز آئینہ خانہ ہے حقیقت کا
جہاں میرے تخیل نے پر و بال اپنے کھولے ہیں
تضحیک و التفات میں رہنے دے امتیاز
آ، میں دکھاؤں عرش کو چھوتے ہیں کس طرح
حاصلِ زیست مسرت کو سمجھنے والے
تیری اک ذات سے تعبیر ہے یہ عالمِ کل
سیماب جلوہ تابِ زبان و ادب ہوں میں
وہاں خیال، نہ ہو جاؤں جذبِ جلووں میں
مبارک تجھ کو اپنی خود روی، لیکن یہ سنتا جا
اچھا تمھارے جبر کی کوئی خطا نہیں
اس کے سوا کہ آپ کو دی زحمتِ نمود
غارت ہوئی تو ہیں مری بیداریاں کہیں
وہی سب سے بڑی نعمت ہے جو مل جائے بے مانگے
مرکزِ امن و سکوں ہے جھونپڑا مزدور کا
چشم و دل پر، یوں نشاں باقی ہیں زخمِ عشق کے
قیصری و خسروی تو ڈھلتی پھرتی چھاؤں ہے
اے مذاقِ عشق دینا ساتھ ختمِ کار تک
دیکھنا سیماب برہم ہو نہ عصمت حسن کی
اے عشقِ فنا ساماں، ہو ختم کہیں دنیا
کھلے لفظوں میں کہیے جذبۂ کامل نہیں ملتا
بظاہر ہیں یہی اسبابِ دنیا سے نہ ملنے کے

خراب آباد میں بڑھتی چلی جاتی ہیں تعمیریں
مجھے آتی ہیں تدبیریں، میں کر سکتا ہوں تدبیریں
چھپا کر اپنی صورت، پھینک دی ہیں اپنی تصویریں
وہاں شاہیں کو بھی دیکھا ہے صیدِ زرجوں میں نے
یوں مسکرا نہ دیکھ، ہاں مسکرا کے دیکھ
ہیں تیرے دل پہ ہاتھ مری التجا کے دیکھ
یک نفس غم بھی، کہ دم بھر تو خدا یاد رہے
کیوں نہ وہ سب کو بھلا دے جسے تو یاد رہے
اردو کا ارتقا مرے رنگِ سخن میں ہے
یہاں یہ حال کہ وسعت نہیں نظر کے لیے
کہ دنیا اپنے رستے پر لگا لیتی ہے انساں کو
مجھ کو کیا تباہ مرے اختیار نے
ہم اور کوئی کارِ نمایاں نہ کر سکے
میں اس جہانِ خواب سے تھا بیشتر کہاں
سکونِ دل سے بہتر اضطرابِ دل سمجھتا ہوں
انقلاب اکثر پھرا کرتا ہے ایوانوں کے پاس
جیسے کچھ شمعیں بجھی رکھی ہوں کاشانوں کے پاس
عشق ہی اک جاوداں دولت ہے انسانوں کے پاس
رہ نہ جانا عشرتِ آغاز بن کر دیکھنا
دل میں چھپ کر راز اندر راز بن کر دیکھنا
معمورۂ ہستی میں ویرانے بنائے جا
یہ سب جھوٹی کہانی ہے کہ دل سے دل نہیں ملتا
کسی سے ہم نہیں ملتے کسی سے دل نہیں ملتا

itsurdu.blogspot.com

مجبور ہوں میں سیماب اس لیے راہِ محبت میں
ملی ہے محرمِ انسانیت نگاہ مجھے
جہانِ ہوش پر اب بھی ہے رستگاہ مجھے
ملی نہ جب کہیں دنیا میں امن گاہ مجھے
تھے تمھیں مرکزِ خیال، حد تصورات تک
امن و سکوں کہاں گیا، مہر و وفا کو کیا ہوا
ہم اسے دنیا تری شاہنشہی و قیصری سمجھے
بہارِ تبسم، وقارِ تکلم
ہے لعنت وہ دستور سرمایہ داری
بس اسی ضد میں فنا کا اور بقا کا راز ہے
بارہا ہم نے محبت کا کیا ہے تجزیہ
جنوں وجہِ شکستِ رنگِ محفل ہوتا جاتا ہے
اداسی یاس بن کر چھا رہی ہے سارے عالم پر
محسوس کر رہا ہوں انھیں دل میں دیکھ کر
انقلاب آئیں گے حیرت کدۂ عالم میں
ایک دن یہ ہے کہ ہیں افسانہ خوانِ کائنات
تعلقات کی تلخی کا تجربہ ہے مجھے
الگ ہے سب سے مرا جادۂ سخن سیماب
ذروں میں ہے صلاحیتِ روح و ارتقا
ماہ و نجوم، لالہ و گل، آب و خاک و باد
تعمیر سے غرض ہے، کسی پیرہن میں ہو
سارے جہاں کے فلسفے ہیچ ہیں اس کے سامنے
وفا یہ ہے تو اس وفا پہ غور کر رہا ہوں میں

کوئی مشرب مجھے تقلید کے قابل نہیں ملتا
فقیر بھی نظر آتا ہے بادشاہ مجھے
نباہنا ہے تو اے بے خودی نباہ مجھے
خود اپنے سایہ میں لینی پڑی پناہ مجھے
یوں تو نگاہِ ناشکیب جانے کو چار سو گئی
خطِ خودیٔ میں کھو گئی، خلقِ خدا کو کیا ہوا
یہ رشوت اس کو دے، جو زندگی کو زندگی سمجھے
جسے چاہے جب چاہے دیوانہ کر دے
جو ذہنیتوں کو غلامانہ کر دے
عشق عالم سوز ہے اور حسن عالم ساز ہے
اس میں جو کچھ ہے فقط دلچسپیِ آغاز ہے
زمانہ اپنے مستقبل میں داخل ہوتا جاتا ہے
کسی کا دل ہو اب معنا مرا دل ہوتا جاتا ہے
جیسے ہے کائنات مرے اختیار میں
انقام اپنی تباہی کا یہ دنیا لے گی
ایک دن ہوگا کہ خود ہو جائیں گے افسانہ ہم
کسی سے اب مری دنیا میں رسم و راہ نہیں
عوام جس کے ہیں پیرو وہ میری راہ نہیں
ان کو سمیٹ اور نئے آسماں بنا
لے سب کو ساتھ اور نیا کارواں بنا
کون و مکاں کی قید نہیں، لامکاں بنا
عشق کا امتحاں نہ لے عقل کو آزمائے جا
تیری خوشی ہو رات دن میری خوشی کبھی نہ ہو

جزو کا کل میں سمانا ہی تو ہے کُل ہونا
تھا میں وہ مہرہ بساطِ عدم و ہستی کا
میں کہ پیغمبرِ تہذیبِ سخن تھا سیماب
مجھے بعد فنا یوں پھینک آئی، گور میں جا کر
خوشی میں استواری ہے، نہ غم میں پائداری ہے
نہ ہو اعلانِ غم، شمعیں بجھا دو چاند تاروں کی
اندھیرا ہو گیا، دل بجھ گیا، سونی ہوئی دنیا
ہے مردہ آج ہر انساں، مگر ہے فرق اتنا
ذروں کے دل میں لاکھوں اسرار گھٹ رہے ہیں
جوانی خواب کی سی بات ہے دنیائے فانی میں
بڑھیں گی گرمیاں آب و ہوائے زندگانی میں
جنوں اندر جنوں، آتش در آتش اے معاذ اللہ!
بجھے جاتے ہیں دل، تاریک محفل ہوتی جاتی ہے
محبت ہو، وفا ہو، آرزومندی ہو یا حسرت
اے مسافر، ہے وہی آخری منزل تیری
مطمئن حال پہ دنیا کے نہ ہو دیوانے
منارِ راہ بنے، گردِ کارواں کیوں ہو
فرشتے کیوں نہ شریکِ مہمِ دنیا ہوں
میں تو پرست و تنوع پسند اور فطرت
نگاہِ برق ہے میرے ہی آشیاں کی طرف
تمہارے پاس تجلی کے سینکڑوں امکاں
نہ ہوگی رزم اگر، تو بزم وجہِ برہمی ہوگی
زمانہ گر مخالف ہے ترا، بے مدعا ہو جا

آہ، وہ قطرہ جو گھبرا کے سمندر سے چلا
آ گیا پھر اسی گھر لوٹ کے، جس گھر سے چلا
سلسلہ شعر مہذب کا مرے گھر سے چلا
یہ دنیا جیسے اک بارِ گراں سر سے اتار آئی
مرے حصے میں تیری ہر نوازش مستعار آئی
بساطِ کائنات الٹو کہ مجھ کو یاد یار آئی
بڑی ویرانیوں کے ساتھ شامِ انتظار آئی
کوئی مزار کے باہر کوئی مزار میں ہے
کوئی زباں لگا دے صحرا کی خامشی میں
مگر یہ بات کس کو یاد رہتی ہے جوانی میں
ابھی تو خاک زادے بھر رہے ہیں آگ پانی میں
محبت شاذ و نادر راس آتی ہے جوانی میں
یہ دنیا قبر بن جانے کے قابل ہوتی جاتی ہے
اب اک لاحاصلی ان سب کا حاصل ہوتی جاتی ہے
ختم جس گام پہ دلچسپیِ دنیا ہو جائے
نہیں معلوم گھڑی بھر میں یہاں کیا ہو جائے
ہماری خاک بتدریج رائیگاں کیوں ہو
تمام عمر ہمارا ہی امتحاں کیوں ہو
طلوعِ شام و سحر کے سوا کچھ اور نہیں
تو کیا یہاں مرے گھر کے سوا کچھ اور نہیں
ہمارے پاس نظر کے سوا کچھ اور نہیں
کسی صورت سے ہو، دنیا تو اک دن ختم ہی ہوگی
نہ دل میں مدعا ہوگا نہ دنیا مدعی ہوگی

itsurdu.blogspot.com

میں اے سیماب سورج بن کے چمکا ہوں اندھیروں میں
بزمِ عالم کا مجھ سے حال نہ پوچھ
ہے نیا روپ روز دنیا کا
عشق کی راہ گزر میں ہم نے
کھینچی ہے مصور نے عجب شان سے تصویر
ہوتے نہیں پابند، روش جن کی ہے آزاد
عشق ہے سہل، مگر ہم ہیں وہ دشوار پسند
تجھے ہے فکر اپنے ایک گھر کی، یہاں جہانِ انقلاب میں ہے
یہاں ہے ہر مظہر اک حقیقت یہاں ہے ہر مظہر ایک جلوہ
ابھی ہے احساس خام اس کا، شعور ہے نا تمام اس کا
برہم مزاجِ عالم امکاں ہے آج کل
دشوار زندگی کا ہوا ہے معاملہ

لوحِ محفوظ

محبت عقل کے بس کی نہیں، راہِ جنوں پر چل
اے تن آسانی ہمارا دامنِ ہمت نہ کھینچ
یہ ہوا معلوم، تھے صدیوں سے محوِ بے خودی
دل کشا، دل آزما، دل سوز، دل جو، دل نواز
دیکھیے اس خانہ ویرانی کا کیا انجام ہو
اگر رستے میں موسیٰ دیکھنے کی ضد نہ کر جائیں
امیدِ عزم میرے کارواں کی شاہراہیں ہیں
پہلے مرے سہارے پہ تھا کاروبارِ زیست
جی چاہتا ہے عمرِ محبت نہ ختم ہو

نہ ہونے سے مرے، محسوس دنیا میں کمی ہوگی
انتہا کی بد انتظامی ہے
یہ پرانی کبھی نہیں ہوتی
پانوں رکھا تھا کہ سر یاد آیا
جیسے کوئی میری ہی طرف دیکھ رہا ہے
دیکھے ہیں کبھی پانوں بھی دریا کے کسی نے
کار آساں کو بھی دشوار بنا لیتے ہیں
چمن ہو جب معرضِ خطر میں تو آشیاں کس حساب میں ہے
سراب تو اس لیے ہے دنیا کہ تو فریبِ سراب میں ہے
یہ حال ہے کچھ مرے وطن کا، نہ جاگتا ہے نہ خواب میں ہے
جو مطمئن ہے وہ بھی پریشاں ہے آج کل
تو واقعی قریبِ رگِ جاں ہے آج کل

کہ رہبر سے زیادہ آگہی ہوتی ہے رہزن کو
مشکوں کی حد تک آئے ہیں بڑی مشکل سے ہم
دفعتاً چونکے جو آوازِ شکستِ دل سے ہم
دل ہے عالم ساز، جو چاہیں بنا لیں دل سے ہم
اپنی دنیا لے کے نکلے ہیں کسی کے دل سے ہم
تو پھر گھر پر ہو سامانِ تجلی، طور پر کیوں ہو
جو ہو مایوس منزل سے وہ میرا ہم سفر کیوں ہو
اب میں ہوں زندگی کا سہارا لیے ہوئے
مر جایئے کسی کی تمنا لیے ہوئے

ناز ادھر، نیاز ادھر، کتنا غلط نظام ہے
دے کر فروغ قوتِ فکر و نظر کو میں
یہ ہے حقیقتِ غم و غم خوارئ جہاں
رکھ آشنائے راہ وطن مجھ کو اے جنوں
دن رات چل رہے ہیں مرے ساتھ راستے
آڑ میں تیری کبریائی کی
زندگی موت بنتی جاتی ہے
جیسے دنیا میں کوئی تھا ہی نہیں
بندگی سے ملے کہیں تو نجات
موج دائرہ بن کر آشنائے مرکز ہے
اب کھلا کہ میں ان کی ذات کا خلاصہ ہوں
تھا مقابلہ سیماب عمرِ بزمِ فانی سے
یہ مرا تصور مستقل ہے مثالِ سایہ قدم قدم
ہے چل چلاؤ پہ عالم یوں ہی ہمیشہ سے
نگاہ و دل پر اک ایسا بھی واقعہ گزرا
بے دلی موت نہیں موت سے بھی بدتر ہے
وہ گرے یاد انھیں جس نے بھلایا ہو کبھی
شامل وضع تھی خود داریٔ فطرت سیماب
زیارت ہے ابھی باقی تجلی گاہ جاناں کی
قریبِ شام، رنگ و بو کی سن خاموش تسبیحیں
تجاہل کب تک، آخر وہ مجھے پہچان جائیں گے
دل کے ٹکڑے پھول کلیوں میں امانت کر دیے
وہ خودی جس نے خدائی حوصلوں کے ساتھ کی

حسن نہیں غنیم ہے، عشق نہیں غلام ہے
پھیلا رہا ہوں زندگی مختصر کو میں
دو دن میں یاد بھی نہ رہا نوحہ گر کو میں
شاید پھر اتفاق سے یاد آؤں گھر کو میں
رہ گیر دیکھتا ہوں ہر اک رہ گزر کو میں
ذرے ذرے نے خود نمائی کی
حد بھی ہے صبر آزمائی کی
ہائے راتیں تری جدائی کی
ایک حد کھینچ دے خدائی کی
بن گیا یقیں آخر پھیل کر گماں اپنا
پوچھ کر پتہ میرا دے گئے نشاں اپنا
ہم بھی چھوڑ آئے ہیں نقشِ جاوداں اپنا
میں ہی کے ساتھ ہوں دم بہ دم، وہ نہیں رہے، وہ نہیں سہی
بتائے کون کہ یہ سلسلہ کہاں سے چلا
کہ جیسے پردہ کوئی اٹھ کے درمیاں سے چلا
جان لے لے مری، محروم نہ کر دل سے مجھے
میں نے ان کو نہ بھلایا نہ کبھی یاد کیا
ہم جسے بھول گئے پھر نہ اسے یاد کیا
میں اس دنیا پہ کیوں بازی لگا دوں دین و ایماں کی
سمٹ کر جب زباں بن جائے ہر پتی گلستاں کی
کمال جہل ہی سے ابتدا ہوتی ہے عرفاں کی
یہ خزانے میں نے گلشن کو ودیعت کر دیے
اس سے یہ پوچھو کہ انساں کتنے غارت کر دیے

itsurdu.blogspot.com

جن سے دورِ حال کی تہذیب کا امکان تھا
فکرِ دنیا، کاوشِ عقبیٰ، غمِ عشق و وفا
فکر کو سیماب آزادی کی دے کر وسعتیں
ہائے تنہائیاں محبت کی
ادب میں ہے ابھی امکانِ وسعت اے سیماب
غم بہرحال مقدر تھا، نہ تھی اس سے نجات
ہائے وہ وعدہ کہ دنیا سے لگائیں گے نہ دل
ہے عصرِ نو سے یہ اک شرطِ انقلاب کے بعد
ہم اپنے سر کہاں اچھا بُرا الزام لیتے ہیں
میں جب چاہوں گا اک جھٹکے میں اس کو توڑ ڈالوں گا
بجائے خود مری ہستی تھی اک نیا رومان
نظامِ عالمِ ہستی میں کوئی عیب نہیں
یوں مطمئن تھا میں دمِ تعمیرِ آشیاں
ڈھونڈا گیا تو کچھ بھی نہ نکلا سوائے غم
میں نے شبِ غم جن کو سمیٹا تھا بمشکل
بڑھتی ہی چلی جاتی ہے دنیا کی خرابی
میرے صحرائے محبت کی نمو کاری نہ پوچھ
اب حقیقت کھل گئی تو اس سے دل بے زار ہے
بارِ غم سے آج ہی کیا نبضِ دنیا سست ہے
کس طرح دونوں میں نبھتی، کس طرح ہوتا نباہ
مجھے اے انقلاب وقت اسی دنیا میں رہنا ہے
ہستی ہے اک جنونِ تباہی کی منتظر
سمجھتا ہوں کہ نصبِ العینِ ہستی بے نہایت ہے

میں نے ماضی کے وہ سب آثار رخصت کر دیے
جتنے غم تھے سب خدا نے مجھ کو قسمت کر دیے
مرتے ہم نے غزل کے بے نہایت کر دیے
غم بھی ان کا شریکِ حال نہیں
زباں حقیقتِ فن کی تلاش میں ہے ابھی
غمِ الفت جو نہ ہوتا، غمِ دنیا کرتے
دائے مجبوری کہ اب دنیا سے فرصت ہی نہیں
ہم اب رہیں جو زمیں پر تو آسماں نہ رہے
مقدر خود بناتے ہیں، خدا کا نام لیتے ہیں
کوئی رشتہ نہیں ہے پاؤں سے زنجیرِ زنداں کا
ہزار شکر کہ میں زیبِ داستاں نہ ہوا
ذرا سا نقص یہی ہے کہ جاوداں نہ ہوا
جیسے مری زمیں پہ کوئی آسماں نہ تھا
عاشق کا دل تھا کیسۂ بازی گراں نہ تھا
وہ تیرگیاں بعدِ سحر پھیل گئیں اور
اس پہ یہ قیامت، ابھی رہنا ہے یہیں اور
اس خراب آباد کا ہر ذرہ عالم ساز تھا
رنگِ ہستی تھا بہت دلچسپ جب تک راز تھا
اس سے پہلے بھی مزاجِ زندگی ناز ساز تھا
عشق دنیا سوز تھا اور حسن دنیا ساز تھا
نہ چھیڑ اتنا کہ دنیا ہی سے دل بے زار ہو جائے
صحرا کی وسعتوں کو گریباں کیے ہوئے
مجھے منزل پہ بھی منزل کا دھوکا ہو نہیں سکتا

جو ذہن میں ہے وہ تصویر بن نہیں چکتی
عالم نو جانے کس مخلوق سے آباد ہو
تدبیر آزما ہوں بہ تقدیرِ انقلاب
کر اپنے موج خیز خیالوں کی روک تھام
دل ہے چراغ خانۂ مفلس نہ توڑ اسے
میری ہر نظر سجدہ، میرا ہر نفس تسبیح
میں کسی سے دنیا میں آشنا نہیں سیماب
وہ میرے تصور کی صد رنگ محفل صباحت کا مرکز، ملاحت کی منزل
وحدت و کثرت کے جلوے خلقتِ انساں میں دیکھ
مرا حالِ دل کیا معمہ تھا یا رب
مجھے بھی کچھ تو خیال رکھنا ہی چاہیے اپنی زندگی کا
یہ آدمی ہے وہی کھلاڑی، جو کھیلتا تھا غم و خوشی سے
یقیں رکھ حاصلِ لا حاصلی پر
ہزاروں عظمتیں ہیں دفنِ دنیا کے خرابوں میں
نظر کی، دل کی یا آواز کی تخصیص مشکل ہے
ہر سو رواں دواں ہیں خیالوں کے قافلے
دنیا قدم قدم پہ مجھے روکتی رہی
ہوں وفا کردار، پیمانِ وفا کرتا ہوں میں
التجا یہ ہے کہ واپس التجائیں کر مری
یہی تصور کے کھیل کب تک، گمان بدلے نہ کیوں یقیں سے
سفر ہے بے خواہش و ارادہ، نہ کوئی منزل نہ کوئی جادہ
نثار کر دیں گے اس پہ سیماب قوتیں غیرت و وفا کی
بے قراری سے کہے دیتا ہوں رکھے احتیاط

بنا بنا کے ہیولا مٹا رہا ہے کوئی
آدمی میں آدمیت کی کمی ہونے لگی
مجھ کو یقین ہے کہ یہ دن پھر نہ آئیں گے
یہ پھیل جائیں گے تو سمیٹے نہ جائیں گے
پھر غم کی رات آئی تو ہم کیا جلائیں گے
اور کس کو کہتے ہیں بندگی، خدا جانے
خود ہی جو مسافر ہو وہ کسی کو کیا جانے
کہیں شام رقصاں، کہیں صبح خنداں، کہیں ماہ پارے کہیں مہر پارے
ایک ذرہ اس قدر پھیلا کہ دنیا ہو گیا
نگاہوں نے کی عمر بھر ترجمانی
میں ساتھ دوں گا کہاں تک آخر ترے ملال اور حزن کی فتنی کا
مگر اسی آدمی کے ہاتھوں بگڑ گیا کھیل زندگی کا
یہاں جو کھو رہا ہے پا رہا ہے
زمیں ہر دور میں کرتی رہی ہے آسماں پیدا
بہ توفیقِ محبت درد ہو جائے جہاں پیدا
میں اپنے گھر میں ہوں، مری دنیا سفر میں ہے
گو دیکھتی رہی کہ مسافر سفر میں ہے
انتہا کی آپ جانیں، ابتدا کرتا ہوں میں
مدعا یہ ہے کہ ترکِ مدعا کرتا ہوں میں
جو آج تک ذہن آشنا ہے، اسے نظر آشنا کریں گے
جہاں سے پہنچے ہیں انتہا پر، وہیں سے پھر ابتدا کریں گے
وطن سے جو عہد کر چکے ہیں، وہ عہد اک دن وفا کریں گے
خیر اب تو میرے لب پر ان کا نام آ گیا

itsurdu.blogspot.com

نہ مجھے شگفتِ خیال دی، نہ خیالِ عقدہ کشا دیا
تھی جو بات خاصۂ زندگی، مجھے یادِ زندگی بھر رہی
میں ہوں اک مستقل عنوانِ ہستی کے فسانے میں
مجھے افسوس ہے دنیا کی اس افسانہ سازی پر
اب اس دنیا سے ہے تعمیر کی امید لا حاصل
بھرے گی ان کو میرے بعد لاکھوں رنگ سے دنیا
جھکا اس وقت، جب مجبور سجدہ خود ہو سر تیرا
جو ہے زندانِ غم دنیا تو فکرِ این و آں کیوں ہے
خلد بریں کے بعد دیا خاک داں مجھے
مسافر اپنے پہلو ہی میں مل جاتی تجھے منزل
بالآخر پھر پھرا کر اپنے ہی در پر پھر آ بیٹھے
دل اک قطرہ تھا، ژولیدہ، چکیدہ، سیلِ غم دیدہ
دل اے سیماب خالی آرزو سے رہ نہ سکتا تھا
یہ ہے جبرِ فطرت کہ دارِ فنا میں
یہ میرے تصور کی گہرائیاں ہیں
نہیں ہوں تو ہونے کا احساس کیوں ہے
بلند و پاک فضاؤں میں رقص ابرِ سیاہ
ہر گوشۂ نظر میں ہے اک محشرِ خیال
خوش و سرگشتہ تھے، نہ منہ سے بولے نہ سر سے کھیلے
اک ایسے عالمِ وارفتگی میں ہوں کہ جہاں
مری نگاہ میں ہے اک زندہ مستقبل
تھے خود ہیں مگر خود نما ہو گئے ہم
کبھی خوش کبھی غمزدہ ہو گئے ہم
کوئی زندگی ہے یہ زندگی، جسے اک طلسم بنا دیا
مگر ایک ایسی بھی یاد تھی جسے مصلحت نے بھلا دیا
مجھے تاریخ دہراتی رہے گی ہر زمانے میں
کہ اپنی بھی کہانی چھیڑ دی میرے فسانے میں
یہ دنیا آج خود مصروف ہے اپنے مٹانے میں
فلائیں چھوڑ دی ہیں میں نے کچھ اپنے فسانے میں
ہے بے حد فرق بابا سر کے جھکنے اور جھکانے میں
قفس رہنے کے قابل کیوں نہیں ہے، آشیاں کیوں ہے
انساں بنا کے خوار کیا ہے کہاں مجھے
اگر منزل سے پہلے تجھ کو اپنی جستجو ہوتی
کہاں تک جستجو کرتے، کہاں تک جستجو ہوتی
ذرا سی بوند پھر کیا اشک بنتی، کیا لہو ہوتی
نہ ہوتی آرزو تو آرزو کی آرزو ہوتی
ضروری نہیں میرا ہونا، مگر ہوں
کہ چھایا ہوا تیرے احساس پر ہوں
مری غایتِ بود کیا ہے؟ اگر ہوں
کہ جیسے زلف بدوش اک دوشیزۂ عربی
گھبرا گئے ہیں اپنی نگاہ رسا سے ہم
جو تیری تصویر کی ہے صورت وہی تصور کا حال بھی ہے
کسی کا اپنے سوا مجھ کو انتظار نہیں
میں اپنے ماضیِ مردہ کا سوگوار نہیں
ہمیں دیکھیے کیا سے کیا ہو گئے ہم
جو کچھ ہم کو ہونا ہوا، ہو گئے ہم

نہ تھے ہم زمانی، نہ باقی نہ فانی
ہے سرتوں کی یہی سزا کہ میں کاشوں میں ہوں مبتلا
یہ غبارِ عظمتِ رفتگاں ابھی کیوں بنا نہیں کارواں
یہ خودی کے نشہ میں بولے! وہ اجارہ دارِ خدائی کے
انساں تہا رہا ہے انسان کے لہو میں
فرق ایمان و محبت میں نہیں
ایک عالم میں کہاں سب کی بسر ہوتی ہے
خوش ہوں سیماب میں تنقید سے کم بینوں کی
ہر طرف ایک ہی تصویر نظر آتی ہے
کیا کوئی اور امیدوں کا ٹھکانہ ہی نہیں
نہ جانے ایسی کیا بجلی بھری ہے چند حرفوں میں
میں کیا کہہ کر پکاروں، کس طرح آواز دوں اس کو
ہمیشہ مشکلوں کی انتہا ہوتی ہے آسانی
تمھیں کو مانگتا ہوں تم سے، وہ ضدی بھکاری ہوں
میں خاکسار ہوں پھر مجھ سے سرگرانی کیوں
ہوں اہتمامِ ترکِ تعلق پہ مطمئن
دل میں جو چند عارضی جذبے خوشی کے تھے
پھیلے تو یوں کہ چھا گئے کُل کائنات پر
خدا کی مصلحتیں راز ہی سہی سیماب
بنیادِ ہر عمل ہے فقط اعتبار پر
بس مختصر یہ ہے کہ محبت نہ کیجیے
موجزن اک جذبۂ عالم پناہی دل میں ہے
تنگ و محدود ہے پرواز کہ فکر و نظر
جو کچھ آپ نے کہہ دیا ہو گئے ہم
غمِ جاں رہا کی، نہیں نہیں، غمِ جاں فنا کی تلاش ہے
یہ ہے کیں جہاں میں بلا ہوں اسے کس ہوا کی تلاش ہے
ہیں یہاں خدا ہی خدا پڑے، تجھے کس خدا کی تلاش ہے
اس شورِ ہاؤ ہُو میں اللہ تو کہاں ہے
ہو بھی تو میری شریعت میں نہیں
شام، پروانوں کی نظروں میں سحر ہوتی ہے
کچھ بلند اور مری فکر و نظر ہوتی ہے
آپ کی جلوہ گہ حسن طلسماتی ہے
سارا عالم اسی اک در پہ مٹا جاتی ہے
تڑپ جاتا ہے دل جب لب پہ ان کا نام آتا ہے
تصور میں یہ کس کا جلوۂ بے نام آتا ہے
شبِ غم، صبح بن جاتی ہے بالآخر بسر ہو کر
مرے دستِ دعا میں خود ہی آ جاؤ اثر ہو کر
ذرا زمین سے کہہ دو کہ آسماں نہ بنے
گویا کہ اپنے دل پہ مجھے اختیار ہے
وہ بھی دبے ہوئے غمِ پنہاں میں رہ گئے
سمٹے تو اس قدر کہ رگِ جاں میں رہ گئے
مگر ستائے ہوؤں پر عتاب کیا معنی
بے چارگیِ ذہنِ عبادت نہ پوچھیے
تفصیلِ تجرباتِ محبت نہ پوچھیے
میں ہی کیا مشکل میں ہوں سارا جہاں مشکل میں ہے
جس پہ سب بند ہوں رستے وہ کدھر سے گزرے

itsurdu.blogspot.com

تھا کہاں وقت کہ ہستی کے فسانے پڑھتے
صرف عنوان ہی عنوان نظر سے گزرے

کیسی پرواز، کچھ اس ڈھب سے کیا مجھ کو اسیر
کہ ہوا تک بھی نہ ہو کر کسی پر سے گزرے

نیستی و ہستی میں ضد ہے اک زمانے سے
مطمئن نہیں فطرت آدمی بنانے سے

عذر تو بجائے خود اک گناہ ثانی ہے
ذوق جرم بہتر ہے، جرم بخشوانے سے

رگ و پے میں سرایت کر چکی ہے سمیت غم کی
بس اب سوز و گداز روح و تن کی آزمائش ہے

زہر اب غم کو جذب رگ جاں کیے ہوئے
خود زندگی ہے موت کا ساماں کیے ہوئے

آمادۂ خرابی عالم ہے ارتقا
قطرے کو بحر، بحر کو طوفاں کیے ہوئے

رکھنا تبرکات میں زنجیر کو مری
یہ بھی ہے سجدۂ در زنداں کیے ہوئے

سیماب ایک سادہ ورق ہے حیات حال
مدت گزر گئی کوئی ارماں کیے ہوئے

بڑھائے جا یونہی گہرائیاں اپنی عقیدت کی
یقیں میں خود وہ آجائے گا کھنچ کر جو گماں میں ہے

مجھے کیوں سونپتا ہے انتظام محفل عالم
بنا رکھی تھی میں نے محفل عالم کی، یا تو نے

ترا ہونا تو برحق ہے مگر آئے یقیں کیوں کر
مری آواز پر اب تک کبھی دی ہے صدا تو نے؟

جب کوئی مہر و وفا کا مجھ کو دیتا ہے فریب
دیکھ کر ماضی کی جانب مسکرا دیتا ہوں میں

یاد کرنے کا مزہ یہ ہے کہ گم ہو ماسوا
جب وہ یاد آتے ہیں خود کو بھی بھلا دیتا ہوں میں

خوشی و غم سے یہاں رہا دم ہے امتزاج مزاج عالم
نفس نفس پر ملے گا ماتم، قدم قدم پر خوشی ملے گی

جو یہ سمجھ لے تو مرنے سے پھر کوئی نہ ڈرے
کہ موت ایک حقیقت ہے زندگی کی طرح

کل کسی قافلے میں جن کا نہ تھا کوئی مقام
آج وہ قافلہ سالار نظر آتے ہیں

سحر ہوگی تو پھر ہوں گے افق سے ضوفگن ہم بھی
کہ سورج کی طرح ڈوبے ہیں اے شام وطن ہم بھی

کچھ ایسے وقت بھی آتے ہیں جب مایوس انساں کو
خوشی بھی اک طرح کا سانحہ معلوم ہوتی ہے

قاصد ہیں جبرئیل علیہ السلام بھی
ہے کیا مقام شعر و ادب کا مقام بھی

○

itsurdu.blogspot.com

سیماب اکبرآبادی (شیخ عاشق حسین صدیقی) کا شمار اردو کے ممتاز اساتذۂ سخن میں ہوتا ہے۔ 5 جون 1882 کو اکبرآباد (آگرہ) میں پیدا ہوئے۔ فصیح الملک داغ دہلوی کے شاگردوں میں علامہ اقبال کے بعد سب سے زیادہ شہرت علامہ سیماب کو حاصل ہوئی۔ انھوں نے تقریباً تین سو کتابیں تصنیف کیں جن میں تمام مروجہ اصناف شاعری کے علاوہ تنقید، افسانہ، ڈراما، تحقیق اور ترجمہ وغیرہ شامل ہیں۔ سیماب کے تقریباً تین ہزار شاگرد ہوئے۔ اردو کے اس مجتہد نے ادب میں آگرہ اسکول کا تصور دیا۔ نشر و اشاعت کے فروغ کے لیے 'قصرالادب' نامی ادارہ قائم کیا جس کے تحت متعدد کتابیں شائع کیں اور رسائل و اخبارات جاری کیے جن میں رسالہ 'شاعر' قابلِ ذکر ہے جو آج بھی جاری ہے اور اپنی اشاعت کے 80 برس پورے کر رہا ہے۔ 31 جنوری 1951 کو ان کا انتقال ہوا۔

اس مونوگراف کے مصنف نوجوان شاعر اور قلم کار حامد اقبال صدیقی ہیں۔ ان کا تعلق علامہ سیماب اکبرآبادی کے خانوادے سے ہے۔ 'معلومات عامہ' کے حوالے سے ان کی پانچ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان دنوں وہ ماہنامہ 'شاعر' (ممبئی) کے معاون مدیر ہیں۔

ISBN : 978-81-260-2438-4

9 788126 024384

Rs. 40

Seemab Akbarabadi (*Urdu*)